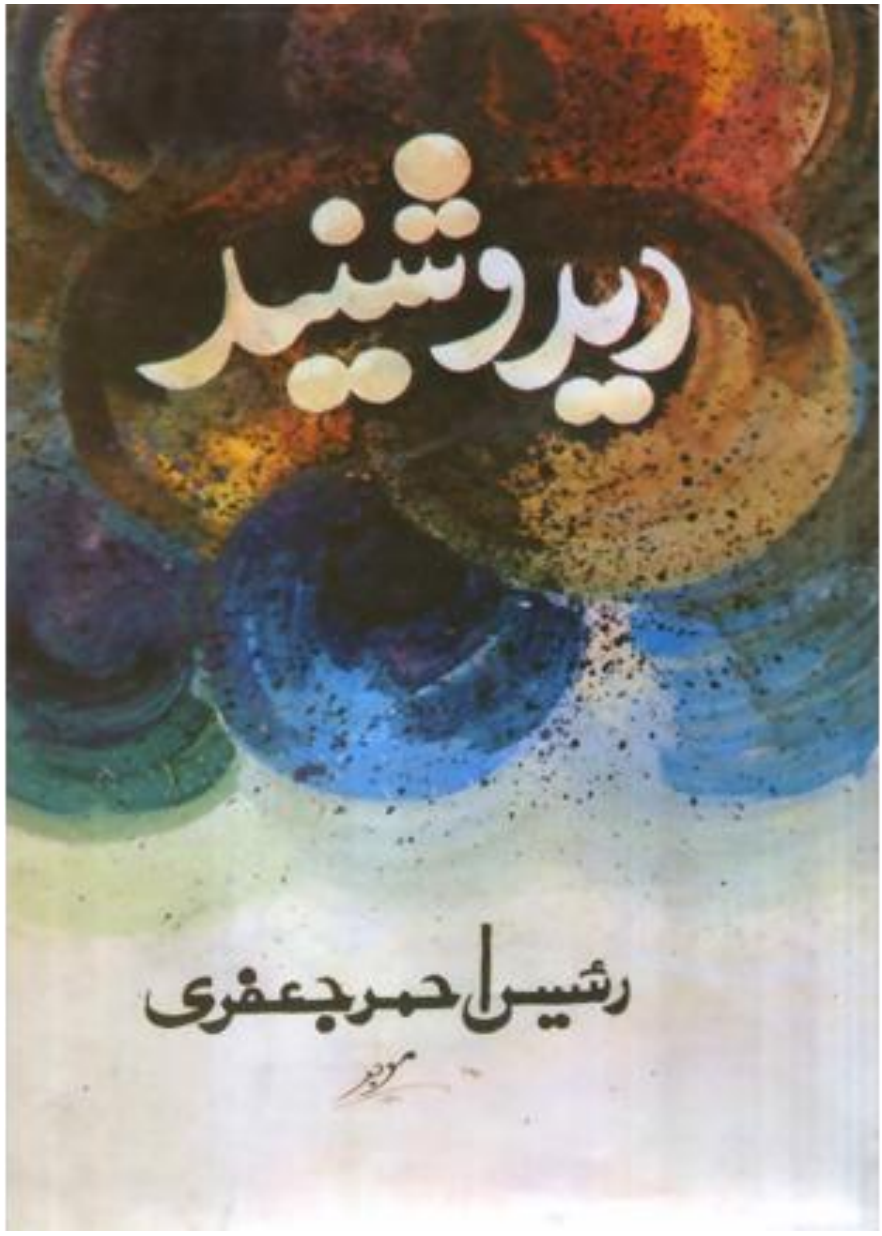

جملہ حقوق محفوظ ہیں

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت ثانی	۱۹۸۷ء
اشاعت اوّل	۱۹۴۸ء
کتابت	مظفر گجراتی
سرورق	بشیر موجد
مطبع	عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد نمبر ۱۔ کراچی
قیمت	۶۵ پینسٹھ روپے

رئیس احمد جعفری اکیڈیمی
ابی۔ ۵ معمار ٹیرس
گلشن اقبال ۱۔ کراچی

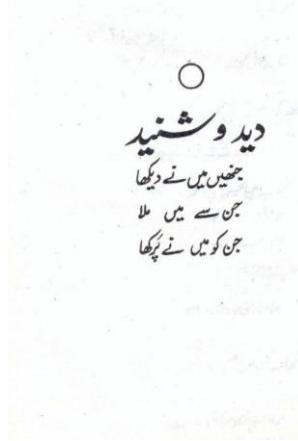

دید و شنید

جنھیں میں نے دیکھا
جن سے میں ملا
جن کو میں نے پرکھا

انتساب

چشمِ بصیرت کے نام

فہرست مضامین

حرفے چند — رفیع احمد جعفری - ۱۵
دیباچہ — ڈاکٹر تحسین فراقی - ۱۷
نظرے خوش گزرے — رئیس احمد جعفری - ۳۳

(۱) مجاہدین صف شکن

بہ ترتیب حروف تہجی

سید امین الحسینی مفتی اعظم - ۳۵
علامہ ثعلبی - ۳۸
ڈاکٹر حبر انوس - ۴۰
خالدہ ادیب خانم - ۴۲
غازی رؤف پاشا - ۴۶
علامہ موسیٰ جار اللہ - ۴۹

(۲) علمائے کرام

مولانا ابوالکلام آزاد - ۵۱
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی - ۵۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مولانا آزاد سبحانی - ۵۸
مولانا اسلم جیراج پوری - ۶۰
مولانا حیدر حسن خاں - ۶۲
مولانا حسین احمد مدنی - ۹۳
مولانا سید سلیمان ندوی - ۹۵
مولانا شبیر احمد عثمانی - ۱۰۱
مولانا طاہر سیف الدین - ۱۰۳
مولانا عبدالماجد دریابادی - ۱۰۷
مولانا عرفان - ۱۱۴
مولانا خواجہ کمال الدین - ۱۲۰
مولانا معین الدین اجمیری - ۱۲۲
مولانا السورتی - ۱۲۵
مولانا مسعود علی ندوی - ۱۲۹

(۳) صوفیۂ عظام

مولانا اشرف علی - ۱۳۴
خواجہ حسن نظامی - ۱۴۰
مولانا عین القضاۃ - ۱۴۵

(۴) رہنمایانِ ملّت

قائدِ اعظم جناح - ۱۴۹
حسرت موہانی - ۱۵۲
حسین شہید سہروردی - ۱۵۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

محمد اسماعیل چندریگر - ۱۵۹
سر سکندر حیات خان - ۱۶۱
شعیب قریشی - ۱۶۳
ظفر علی خاں - ۱۶۵
ظفر الملک علوی - ۱۶۸
فیروز خان نون - ۱۷۰
لیاقت علی خان - ۱۷۳
خلیق الزماں - ۱۷۵

(۵) کانگرس کے عبد و معبود

مسٹر آصف علی - ۱۷۷
مس امت السلام - ۱۷۹
جواہر لال نہرو - ۱۸۲
راجندر پرشاد - ۱۸۵
سید حسین - ۱۸۷
سر شفاعت احمد - ۱۹۱
سید عبداللہ بریلوی - ۱۹۳
مسٹر گاندھی - ۱۹۵
پنڈت مدن موہن مالوی - ۱۹۷
ڈاکٹر سید محمود - ۲۰۰
مرارجی ڈیسائی - ۲۰۲
مسز سروجنی نائیڈو - ۲۰۴
ولبھ بھائی پٹیل - ۲۰۷
مسٹر یٰسین نوری - ۲۰۹

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۱۰

(۶) کمیونسٹ پارٹی کے رہنما

ڈاکٹر اشرف - ۲۱۳
پورن چند جوشی - ۲۱۵
سید سجاد ظہیر - ۲۱۸

(۷) اربابِ آئین و قانون

آصف فیضی - ۲۲۱
بھولا بھائی ڈیسائی - ۲۲۳
حسن امام - ۲۲۵
علی امام - ۲۲۷

(۸) ماہرینِ تعلیمات

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن - ۲۲۹
ڈاکٹر ذاکر حسین - ۲۳۲
سر راس مسعود - ۲۳۶
سر رفیع الدین - ۲۴۰
ڈاکٹر ضیاء الدین - ۲۴۳
پروفیسر طاہر الیس محمدی - ۲۴۸
ڈاکٹر عابد حسین - ۲۵۱
پروفیسر کیلاٹ - ۲۵۳
پروفیسر محمد مجیب - ۲۵۵

جملہ حقوق محفوظ ہیں

(۹) اصحابِ ادب

احمد شاہ بخاری - ۲۵۷
رشید احمد صدیقی - ۲۶۱
سجاد حیدر یلدرم - ۲۶۳
ظہور احمد وحشی - ۲۶۵
مولانا عبدالحلیم شرر - ۲۶۷
مولوی عبدالحق - ۲۶۹
خواجہ عبدالرؤف عشرت - ۲۷۲
قاضی عبدالغفار - ۲۷۵
مولوی نورالحسن نیّر - ۲۷۹
نیاز فتحپوری - ۲۸۱

(۱۰) شعرائے عصر

اقبال - ۲۸۴
اختر شیرانی - ۲۹۳
بہزاد لکھنوی - ۲۹۵
جگر مرادآبادی - ۲۹۷
جوش ملیح آبادی - ۲۹۹
حفیظ جالندھری - ۳۰۱
ذوالفقار علی گوہر - ۳۰۳
نوح ناروی - ۳۰۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

(۱۱) حکمائے حاذق

حکیم اجمل خاں - ۳۰۸
ڈاکٹر انصاری - ۳۱۰
حکیم انور حسین - ۳۱۲
حکیم احمد علی - ۳۱۵
ڈاکٹر عبدالعلی - ۳۱۷
حکیم کبیر الدین - ۳۱۹
حکیم نابینا - ۳۲۲

(۱۲) ممالکِ غیر کے سفراء

ہز اکسیلنسی صلاح الدین سنجوتی - ۳۲۵
سفیرِ عراق - ۳۲۹
مسٹر کپ - ۳۳۱
سفیرِ مصر - ۳۳۳

(۱۳) اُمرائے ذی وقار

منشی احتشام علی - ۳۳۵
نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی - ۳۳۷
نواب صاحب چھتاری - ۳۴۰
نواب علی حسن خاں - ۳۴۳
ڈاکٹر عبدالحمید خواجہ - ۳۴۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

حاجی غلام محمد خاں شروانی - ۳۴۸
سر فضل ابراہیم رحمت اللہ - ۳۵۰
حاجی موسیٰ خاں شروانی - ۳۵۲
کیپٹن مجید خاں - ۳۵۴
مہاراجہ گوالیار - ۳۵۷

(۱۴) کھلنڈرے

احمد حسین قدوائی - ۳۵۹
مسٹر علی حسن - ۳۶۱
غوث محمد - ۳۶۳

(۱۵) دخترانِ ملّت

شہزادی سلمیٰ - ۳۶۵
عطیہ بیگم فیضی - ۳۷۰

حرفے چند

میرے والد مرحوم مولانا رئیس احمد جعفری کا انتقال ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے ہمارے خاندان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہم سب بھائی بہن اتنے کم سن تھے کہ ہمارے لیے اس سانحے کی سنگینی کا اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہماری والدہ محترمہ (بیگم آفتاب جعفری) نے اس صورت حال کا جس ثابت قدمی سے مقابلہ کیا، اس کی مثالیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ انھوں نے ہم بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ ہم نے کبھی یہ محسوس نہ کیا کہ ہمارے سروں سے ہمارے والد کا مہربان سایہ اُٹھ گیا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ اٹھارہ برسوں میں ایک لمحے کے لیے بھی مولانا رئیس احمد جعفری ہم سے جُدا نہیں ہوئے۔

والدہ محترمہ نے ایک طرف تو ہم بچّوں کو اپنی توجّہ کا مرکز بنایا اور دوسری طرف اپنے نامور شوہر کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لیے رئیس احمد جعفری اکیڈیمی قائم کی جس کی وہ تاحیات صدر نشین ہیں۔ اس اکیڈیمی کے خاص خاص مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا جعفری مرحوم کی تصانیف کو عام ناشروں کے استحصال سے بچایا جائے جو بلا اجازت، غیر قانونی طور پر ان کتابوں کو شائع کر رہے ہیں۔

۲۔ مولانا کی تصانیف کے نئے ایڈیشن شائع کیے جائیں۔

۳۔ مولانا کی غیر مدون تحریروں، خصوصاً اخبارات و رسائل میں شائع شدہ مقالات کو کتابی صورت میں منظرِ عام پر لایا جائے۔

۴۔ مولانا کی ایک جامع سوانح عمری شائع کی جائے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۵۔ مولانا کے علمی و ادبی کاموں کا مبسوط جائزہ شائع کیا جائے۔
۶۔ مولانا کی یاد میں ایک اعلیٰ درجے کی ری سرچ لائبریری قائم کی جائے۔
۷۔ ہر سال مولانا کی برسی کے موقع پر ایک علمی سیمینار منعقد کیا جائے۔
۸۔ مولانا کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ صورت میں بعض ناشرین کے پاس موجود ہیں، انھیں حاصل کر کے شائع کیا جائے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے والدہ محترمہ نے سترہ سال قبل ہی کام شروع کر دیا تھا۔ مندرجہ ذیل دو کتابیں بہت پہلے شائع کی جا چکی ہیں:

۱۔ رئیس احمد جعفری۔ شخصیت اور فن
۲۔ کاروان گم گشتہ

اوّل الذکر کتاب برصغیر کے نامور علماء اور ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ ہے جو مولانا رئیس احمد جعفری کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ دوسری کتاب میں تحریک پاکستان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ مولانا اس تحریک کے عینی شاہد تھے، اس لیے انھوں نے اپنی یادوں اور یادداشتوں کے سہارے ایک بے مثال تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب کے مختلف اجزا اخباروں میں شائع ہوئے تھے جنھیں والدہ محترمہ نے مرتب کیا۔ پہلی کتاب بھی انھیں کی مرتبہ ہے۔

گزشتہ دو برسوں سے اکیڈیمی کی طرف سے ہر سال مولانا کی برسی کے موقع پر ایک علمی اجلاس منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ان جلسوں کی مناسبت سے ایک علمی مجلّہ بیادگار رئیس احمد جعفری شائع کیا جاتا ہے۔ اب تک اس نوعیت کے دو مجلّے شائع کیے جا چکے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اکیڈیمی کی طرف سے مولانا کی تصانیف کی رفتارِ اشاعت بہت سست رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے وسائل محدود تھے۔ دوسرے یہ کہ والدہ محترمہ تنہا یہ کام انجام دے رہی تھیں۔ اب میں خدا کے فضل سے اُن کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوں۔ اس لیے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

توقع ہے کہ یہ کام آگے بڑھے گا۔

زیرِ نظر کتاب "دید و شنید" اکیڈیمی کی تیسری پیشکش ہے۔ یہ کتاب، ادبی حلقوں میں مانگ کے باوجود، ایک عرصے سے نایاب تھی۔ یہ نہ صرف مولانا کے باغ و بہار اسلوب کی نمایندگی کرتی ہے، بلکہ اردو کی اُن چند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جنھیں ——— شخصی خاکہ نگاری کا سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بظاہر تو ایک سو آٹھ اہم شخصیات کا تذکرہ ہے، لیکن دراصل یہ ایک عہد کی تہذیبی، سیاسی اور علمی و ادبی تاریخ ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب کے لیے میری فرمائش پر فاضلانہ دیباچہ لکھا ہے، جس کے لیے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

یکم جنوری ۱۹۸۷ء رفیع احمد جعفری

ڈاکٹر تحسین فراقی

دیباچہ

رئیس احمد جعفری علم و ادب کے خار زار کے بے تکان راہی تھے۔ اُردو ادب میں ان جیسے کثیر التحریر بزرگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پھر ان کی تحریروں کا تنوّع بھی حیران کُن ہے۔ سوانح نگاری، شخصیہ نگاری، تاریخ نگاری، ترجمہ، ناول، اقبالیات اور متعدد دیگر موضوعات پر ان کا قلم رواں رہا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی باضابطہ تصنیف "سیرتِ محمد علی" کے ذریعے عبدالماجد دریابادی جیسے ادیبِ شہیر کو حیرت زدہ کر دیا اور اس کے بعد تو وہ شاہراہِ ادب پر اس طرح رواں ہوئے کہ اُنھیں اپنے نقوشِ کفِ پا کو دیکھنے کی فرصت بھی کم ہی مل پائی۔ ع

سرافگندیم بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا!

"سیرتِ محمد علی" جہاں ایک طرف اعلیٰ اقدار سے ان کے لگاؤ اور جذبۂ ملّی سے ان کے انسلاک کی گواہی دیتی ہے وہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آغازِ تصنیف ہی سے سیرت و سوانح رئیس احمد جعفری کا موضوعِ خاص تھا اور اس موضوع سے انھیں مناسبتِ طبعی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں بھی اُنھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ طویل اور مختصر دونوں طرح کی تصانیف ــــ مختصر تصانیف میں "دید و شنید" قابلِ ذکر ہے۔ روایت ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصّہ بھی "دامانِ باغباں" کے نام سے رئیس نے مرتّب کر کے کسی ناشر کے حوالے کر دیا تھا مگر وہ بوجوہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔

"دید و شنید" میں جعفری صاحب نے ایک سو آٹھ شخصیتوں کے طویل و مختصر خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں بھی حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ ان میں مجاہدینِ صف شکن بھی ہیں اور ان کے دوش بدوش علمائے کرام، صوفیہ عظام اور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

رہنمایانِ ملت بھی ہیں۔ یہیں کانگریس کے عبد اور معبود بھی مل جائیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی کے رہنما بھی اپنا رجز بلند کرتے ہوئے سنے جاسکیں گے، ارباب قانون و تعلیمات بھی قانون اور علم کی گتھیاں سلجھاتے نظر آئیں گے۔ ادیب اور شاعر بھی مجلس آرا ملیں گے۔ حکمائے حاذق، سفرائے ممالکِ غیر اور امرائے ذی وقار اپنی حذاقت، سفارت اور امارت کے جوہر دکھاتے ہوئے نظر پڑیں گے اور یہیں کچھ کھلنڈرے اور کچھ دختران ملت اپنے الگ الگ دائروں میں سامانِ صد نشاط کرتے اور عبرت زائی کرتے دکھائی دیں گے۔ اشخاص و افراد کے اس منضبط ہجوم میں قاری کہیں گم نہیں ہوتا بلکہ ایک نئی پہچان سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت اتنی قدیم نہیں۔ اس کا ابتدائی سراغ تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن تذکروں کا ضرورت سے زیادہ اختصار شخصیات کی واضح تصویر کاری میں حارج ہوتا ہے۔ ہاں اس ضمن میں پہلا اجتہادی کارنامہ آزاد کی "آبِ حیات" ہے جس میں شعرا و ادبا کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے مرقعے جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان سے ان کے اخلاق و عادات اور اعمال و میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی رقابتوں، چشمکوں، محبتوں، نفرتوں، معرکوں، مجادلوں اور متعدد دیگر ہدفوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ مرقع آرائی اور سراپا نگاری میں آزاد کا قلم بہت رواں نظر آتا ہے۔ اسی سراپا نگاری سے بعد کے لکھنے والے (خاکہ نگار) متاثر ہوتے۔ چنانچہ اس ضمن میں خصوصیت سے فرحت اللہ بیگ، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور رئیس احمد جعفری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس تمام متحرک تصویر آرائی کے باوجود آزاد ایک تو کہیں کہیں پابندِ تعصب ہو گئے اور دوسرے ان جیتی جاگتی تصویروں کے باطن میں نہ اُتر سکے لیکن چونکہ آبِ حیات اردو شعرا کی تاریخ ہے اس لیے آزاد پر میرا اعتراض ہلکا ہو جاتا ہے۔

کیا ایسا سب خاکہ نگاری کے باب میں مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" اور رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں جہاں اکابر و مشاہیر کے مرقعے کھینچے ہیں۔ وہیں نام دیو مالی اور گدڑی کے لعل نور خاں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ... [illegible] ... خیران ... قعدیل

جملہ حقوق محفوظ ہیں

میں نمایاں نظر آتے ہیں اور مولوی صاحب کا موقف ہے کہ نیکی، خیر اور شرافت کسی ایک دین یا دھرم کی جاگیر نہیں۔ خاکہ نگاری کی ایک کڑی شرط یعنی غیر جانبداری کا پاس مولوی عبدالحق یوں تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن ایک آدھ مقام پر وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکے چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کے ضمن میں ان کے خاکے میں تعصب کی زیریں لہر نظر آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پھر مولوی عبدالحق بعض جگہ مواعظ و نصائح کا دفتر بھی کھول دیتے ہیں جس سے خاکے کی تاثیر میں کمی آجاتی ہے۔

رشید احمد صدیقی زندگی اور زمانے کے بارے میں ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا ان کی تحریروں کا خاص جوہر تھا۔ خاکہ نگاری کرتے ہوئے وہ شخصیت کے باطن میں اترتے اور اسے اپنا اور قاری کا ہم راز بناتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار ان کے ایمان کا حصہ ہیں اس لیے وہ شخصیہ نگاری کے لیے ایسی ہی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جو اعلیٰ اخلاق اور فضائل کا نمونہ ہوں اور زندگی کو بامعنی اور بامراد بنانے کا ہنر جانتی ہوں۔ دلِ دردمند اور نگاہِ پُرسوز نے ان کے خاکوں میں گہرائی پیدا کی ہے اور شگفتگی اور ظرافت کے چھینٹوں نے انھیں تر و تازہ بنایا ہے۔

خاکہ نگاری میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی ایسی شخصیات رئیس احمد جعفری کی پیش رو کہی جاسکتی ہیں۔ جبکہ ان کے معاصر خاکہ نگاروں میں اشرف صبوحی، سالک، چراغ حسن حسرت اور عصمت چغتائی اور نسبتاً بعد کے اہم خاکہ نگاروں میں منٹو، شاہد احمد دہلوی اور شوکت تھانوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ عصمت نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ "دوزخی" کے نام سے لکھ کر اردو خاکہ نگاری کو صاف گوئی اور تحلیلِ نفسی کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا جبکہ منٹو نے بعض شخصیات (مثلاً باری علیگ) وغیرہ کے تہ در تہ اسرار کو کھولنے کی کوشش کی اور تجسس انگیزی کے اپنے مخصوص افسانوی پیرائے کو یہاں بھی کامیابی سے برتا۔ اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی کے خاکے دلی کی تہذیب کے چلتے پھرتے مرقعوں کو خوبی سے نمایاں کرتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے نہ صرف "اجڑا دیار" کے آخر میں "شاہجہانی دیگ کی کھرچن" کے نام سے بعض زندہ اور متحرک شخصیتوں کے نہایت

اجمالی خاکے رقم کیے بلکہ "گنجینۂ گوہر" میں نسبتہً مفصّل خاکوں کی ایک نئی دنیا آباد کی اور تحلیل نفسی، سراپا نگاری اور سحر کار اسلوب کے تال میل سے ایک ایسا انداز نکالا جو ان کی بعد کی کتاب "بزم خوش نفساں" میں بھی پوری شان سے ظہور کرتا ہے ــــ شوکت تھانوی کے متعدد اور متنوّع خاکے مصنّف کی شگفتہ فضا بندی کا ایک عمدہ "شیش محل" تیار کرتے ہیں اور قامت اور قیمت دونوں اعتبار سے لائق توجّہ ہیں۔

ماضی قریب میں جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کی صنف کو باثروت کیا ہے ان میں محمد طفیل، شورش کاشمیری، محی الدین قادری زور، ضیاالدین برنی، عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری، علی جواد زیدی اور ضمیر جعفری قابل ذکر ہیں۔ ان کی کتابوں میں عمدہ خاکہ نگاری کے بیشتر عناصر موجود ہیں۔ حال کے خاکہ نگاروں میں سیّد ابوالحسن ندوی (پرانے چراغ)، نصراللہ خاں (کیا قافلہ جاتا ہے)، رحیم گل (پورٹریٹ) قرۃ العین حیدر (پکچر گیلری)، ممتاز مفتی (اوکھے لوگ) احمد بشیر، گلزار وفا چودھری اور عطاالحق قاسمی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ ان خاکہ نگاروں کے یہاں طویل و مختصر دونوں طرح کے خاکے ہیں۔ بعض کے یہاں تاریخ و سیرت کے عناصر غالب ہیں اور شخصیّت کے پہلو ذرا دب گئے ہیں اور بعض شخصیتوں پر لکھنے والوں کی اپنی شخصیّت کسی قدر غالب آگئی ہے۔ پھر ان لکھنے والوں کے اسالیب بیان بھی منفرد ہیں۔ کسی کے یہاں جذباتی لہجہ غالب ہے کسی کے یہاں خطابیاتی، کسی کے یہاں سنجیدہ تو کسی کے یہاں رقت آفریں جبکہ بعض کے یہاں ظریفانہ و مزاحیہ، لیکن ان سب کے یہاں شخصیات کی تفہیم کے در وا ہوتے ہیں۔

کامیاب خاکہ نگاری کے لیے چند بنیادی شرائط ہیں مثلاً لکھنے والا حکیمانہ نگاہ رکھتا ہو، مسلسل اور دقیق مشاہدے کی ہمت اور میلان رکھتا ہو، شخصیتوں کے انسانی پہلو نمایاں کرنے کو عیب نہ سمجھتا ہو، صداقت نگاری، صاف بیانی، فضا بندی اور سراپا نگاری کا سلیقہ رکھتا ہو اور بات اختصار سے مگر شگفتہ اسلوب میں کہنے پر قادر ہو۔ شخصیّہ نگاری چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن نہ سہی لیکن لمبے چوڑے سقف گیر کینوس کے بجائے مغل مینا تور کا فن ضرور ہے۔ ریاضیاتی ایجاز اور شگفتہ اسلوب تحریر اس کے بنیادی خصائص ہیں۔ کامیاب خاکے کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیّت زیر تحریر کی کلید بن جاتے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ان معروضات کی روشنی میں جب ہم رئیس احمد جعفری کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ خاکہ نگاری سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں شخصیات کا جس قدر تنوّع اور پھیلاؤ ملتا ہے، اس کی صرف دو اور مثالیں ہیں۔ ایک مولانا عبدالماجد دریابادی اور دوسرے شوکت تھانوی جن کے خاکوں میں بھی ایسا ہی ہفت رنگ منظر نامہ مرتّب و مزیّن ملتا ہے۔ "دید و شنید" کا عنوان بذاتِ خود بتاتا ہے کہ مصنّف نے اس کتاب میں ایسی شخصیات پر گفتگو کی ہے جن کے بارے میں اس نے محض سُنا ہی نہیں بلکہ اُنھیں دیکھا بھی ہے۔ چنانچہ یہاں شنیدہ اور دیدہ کے تاثرات باہم آمیز ہو کر ایک ایسی کتاب کی شکل میں مدوّن ہوتے ہیں جو توازن سے ہمکنار اور تعصّب سے بہت حد تک پاک ہے۔ رئیس نے "نظرے خوش گزرے" کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> "مجھے کسی سے عناد نہیں لیکن اظہارِ تاثرات کے وقت میں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی ہے کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا شیفتگی پر؟ لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں، میں نے وہی کیا اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے۔ سچ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خوشگوار ہو۔ کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ بھی آجاتی ہے۔ ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو کہیں تلخ لیکن میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ سچ کے حدود کے باہر نہ نکلنے پائے۔"

"دید و شنید" میں رئیس احمد جعفری نے یا تو صرف اُنھیں شخصیات کو شامل کیا ہے جو برّصغیر میں کوئی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی تھیں یا پھر ان لوگوں کو جو بوجوہ اتنے معروف و مشہور تو نہیں تھے لیکن سیرت و شخصیت کے اعتبار سے عظیم لوگوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھے یا جنھوں نے ایسی زندگی اختیار کر رکھی تھی جو لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتنا تھی۔ گویا مصنّف کے پیشِ نظر محض چند شخصیات کو ایک مخصوص شگفتہ یا مزاحیہ لہجے میں پیش کر کے گرمیِ محفل کا سامان کرنا مقصود نہ تھا بلکہ ان شخصیّات کے حوالے سے اعلیٰ انسانی اقدار اور فضائل و فیوض کو عام کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ زیرِ نظر اوراق میں سادگی، بے نفسی، بوریا نشینی،

جملہ حقوق محفوظ ہیں

دیانتداری، اسلامیت، للہیت، شائستگی، منفرد خیالی، ایمان، آگہی، استقلال، پامردی، حلم، حوصلہ، ہمت، تدبر، توازن اور فکر و فرزانگی کی ارفع اقدار و قائع اور یادداشتوں کے سیاق و سباق میں اس خوبی سے اُجاگر ہوتی ہیں کہ ان اقدار کے حامل بزرگوں سے ملنے، معانقہ کرنے اور صفاتِ ثابتہ کو اپنانے اور اپنی شخصیت کا حصہ بنا لینے کو جی چاہتا ہے۔ پھر انھیں اوراق میں حیرت، عبرت اور آشوب کے منظر ناموں کی بھی کمی نہیں۔ ان میں ایسی شخصیات کا بھی تذکرہ ہے جو ہلال کی صورت افق آگہی پر جلوہ گر ہوئے تھے لیکن اعلیٰ اقدار پر مسلسل عمل اور عظیم مقاصد کی مسلسل پاسداری کے باعث جلد ہی بدر کامل بن گئے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو ماہِ چہار دہم تھے یا سمجھے جاتے تھے، لیکن امتحان اور آزمائش کی ایک آنچ کی تاب بھی نہ لا سکے اور بالآخر ان کی شخصیت کاہیدہ ہو کر ایک ایسی قوس اور کمان کی صورت میں بدل گئی جس کی قسمت میں دائرہ بننا نہیں ہوتا۔

زہد نے اتنی "ترقی" کی کہ عصیاں ہو گیا

خاکوں کے اس مختلف الالوان منظر نامے میں ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن سے رئیس کا رشتہ یار باشی اور قلبی تعلق کا تھا جبکہ بعض سے ان کے مراسم محض چلتے ہوئے تھے اور بعض سے محض صاحب سلامت یا ایک آدھ ملاقات۔ اسی تناسب سے رئیس نے ان پر لکھا اور انھیں جانا اور جاننے کا موقع قاری کو فراہم کیا ہے۔

رئیس احمد جعفری کی اپنی شخصیت چونکہ بالیدہ و بزرگ تھی اس لیے زیر نظر شخصیات میں سے کسی ایک کے بیان میں بھی ان کی اپنی شخصیت دبتی نظر نہیں آئی۔ انھوں نے بڑے اعتماد اور پوری صاف گوئی سے شخصیات کے ضمن میں اپنے تاثرات رقم کیے ہیں، اور کہیں اپنے قلم کو موج نہیں آنے دی۔ ان اوراق میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں جعفری صاحب شخصیتِ زیرِ بحث کے قائل ہو کر اس کے بارے میں اپنے پہلے سے قائم کردہ تاثر سے دستبردار ہوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ شخصیت زیرِ نظر کے بارے میں اپنے سابقہ تاثر کو بے کم و کاست رقم کرنے سے ہرگز نہیں ہچکچاتے۔ اس سے شخصیات کے ضمن میں خود ان کے ہاں ایک تدریج کا پتا چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ رئیس احمد جعفری کی شخصیت میں لچک

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اور توازن کا بہرۂ وافر تھا۔ چنانچہ وہ ابوالکلام آزاد ہوں یا مولانا اشرف علی تھانوی، خالدہ ادیب خانم ہوں یا سید ابوالاعلیٰ مودودی، رئیس احمد جعفری ان کے بارے میں اپنے سابقہ تاثرات یا اندیشے رقم کرنے میں ہرگز جھجک محسوس نہیں کرتے اور پھر ملاقات کے بعد تازہ تاثر پذیری کے اظہار میں بھی نہیں ہچکچاتے۔

رئیس کے زیرِ نظر خاکوں کی ایک بہت نمایاں اور امتیازی خوبی اُن کی سراپا نگاری ہے۔ وہ زیرِ نظر شخصیات کا سراپا اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ ان کے قلم پر کسی ماہر صاحبِ قلم کا گمان ہوتا ہے۔ ان سراپوں سے شخصیات جھکنے، بولنے، چلنے اور چمکنے لگتی ہیں۔ ذیل میں ہنگری کے مشہور مسلم مستشرق ڈاکٹر جرمانوس، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ظفر علی خاں اور عطیہ فیضی (کی جوانی کی تصویر) کے سراپے بالترتیب ملاحظہ ہوں۔ رئیس نے موزوں اور مناسب الفاظ کی مدد سے جیتے جاگتے نقشے کھینچ دیے ہیں۔

ا۔ "ان کی صورت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ گداز بدن، گورا رنگ، گول چہرہ، چوڑی دار پائجامہ، سرج کی ایک بہ جُست اچکن، ترکی ٹوپی، متبسّم چہرہ، آنکھوں میں غور و فکر کی چمک، ادھیڑ عمر۔"

ب۔ "۱۹۳۷ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی، میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پائجامہ، حیدرآبادی وضع کی شیروانی، داڑھی ندارد غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئی، انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا آپ کی تعریف؟ فرمایا ابوالاعلیٰ مودودی۔"

ج۔ "بوٹا سا قد، خشخشی داڑھی، بال کچھ سفید، کچھ سیاہ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی، گفتگو کا ایک خاص انداز، تقریر کا ایک خاص ڈھب، بلند آوازی کے ساتھ ساتھ پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر پیشانی تک تمام نامی اور غیر نامی اعضا و جوارح میں ایک حرکت، ایک اضطراب، ایک ارتعاش، ایک جنبش، باتوں میں ٹھیراؤ، لہجہ میں تبلیغی رنگ غالب۔"

د۔ "سامنے ایک قدِ آدم تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کیا تھی حسن و جمال اور رعنائی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زیبائی، دلکشی، فسوں طرازی کا ایک پیکرِ خاموش تھی، "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"۔ نرگس شہلا کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، گلِ تر کی طرح شگفتہ اور رنگین چہرہ۔ مارِ سیاہ کی طرح بڑی بڑی ـــــ اور بڑے بڑے دلوں کو اسیر کر لینے والی ـــــ زلفیں، جوانی تھی کہ پھٹی پڑ رہی تھی۔ شباب تھا کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ نشہ تھا کہ سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی۔ یہ تصویر کسی فانی ہستی کی نہ تھی۔ یہ تصویر تھی حُسن کی، شباب کی، حسنِ عالم آشوب کی، شباب لازوال کی۔"

کہیں کہیں رئیس نے "حُسنِ حضارت" اور "حُسنِ نسوانی" کی باہم آمیزش سے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش کا سامان کیا ہے۔ اصل میں حسن و جمال، رنگ و رعنائی، عشوہ و ادا اور غمزہ و غوانی کے بیان میں رئیس کا قلم سرشاری کی کیفیت میں رواں ہوتا ہے، ایک ایسا منظر بھی دیکھتے چلیے۔ واضح رہے کہ یہ منظر سر وجنی نائیڈو کے خاکے کا ایک اقتباس ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بمبئی کی کلچرل صورت حال کیا تھی اور یہ بھی کہ رئیس نے اپنی ناول نگاری کے بیانیہ اسلوب سے یہاں بھی خوبی سے کام لیا ہے۔ جزئیات نگاری نے رئیس کی خاکہ نگاری کی دھار تیز کر دی ہے۔

"اس وقت تک بمبئی کے انگریزی ہالوں میں ریگل سب سے زیادہ مرتب، مہذب، نستعلیق، فیشن ایبل اور آرام دہ تھا۔ بمبئی کا وہ پہلا سینما ہاؤس تھا جو ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ ہال کی بالکنی دامانِ باغبان و کفِ گلفروش بنی ہوئی تھی۔ چپہ چپہ جنتِ نگاہ اور گوشہ گوشہ فردوسِ نظر دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے گھرانوں کی متعدد آرٹ نواز خواتین تشریف فرما تھیں، وہ ان کا حسنِ بے حجاب، وہ ان کی زرکار اور رنگا رنگ ساریاں، وہ ان کی مسکراہٹیں، وہ ان کی پہلیاں اور بے باکیاں، وہ ان کی عشوہ طرازیاں اور دلربائیاں، کبھی ساری کے پلو ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ گرنے دینا اور توجہ بھی نہ کرنا، کبھی بالوں کی لٹوں کا رُخِ روشن کو چھپا لینا جیسے چاند گہن میں آگیا اور پھر گردن کے ایک جھٹکے یا دستِ نازک کی ایک جنبش سے ان سرکش زلفوں کو گردن اور پشت کی زینت بنا لینا، رنگ و بو کے اسی عالم

جملہ حقوق محفوظ ہیں

میں گھنٹی بجی، پردہ گرا، روشنی گل ہوگئی اور تاریکی چھا گئی۔ اب ہم "کریا" دیکھ رہے تھے"
رئیس کی زیرِ نظر کتاب میں از اوّل تا آخر شگفتگی اور بے تکلفی کی فضا نظر آتی ہے۔ اس فضا کے بوجھل ہو جانے کا اندیشہ ضرور تھا۔ کیونکہ اس میں علمائے کبار، صوفیۂ عظام اور کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے مشاہیر بھی موجود تھے جن کے ذکر میں دقیق مذہبی، صوفیانہ یا جدلیاتی مباحث کا اجمالاً ہی سہی، چھڑ جانا بعید نہیں تھا، لیکن مصنّف نے بوجھل مقالاتی فضا سے ان خاکوں کو یکسر پاک رکھا ہے۔ چنانچہ متذکرہ حضرات کا ذکر ہو یا شعرا اور حکما کا مصنف کا قلم بڑی سہولت، سلاست، ایجاز اور توازن سے اور کہیں کہیں رمز و ایما کے پردے میں پنہاں و پیدا اپنی جولانیاں دکھاتا چلا جاتا ہے اور گاہے گاہے تخلیقی جملے بھی رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً حکیم انور جبین کے خاکے میں جہاں ان کا جیتا جاگتا مرقع ملتا ہے، وہاں رئیس احمد جعفری قاری کو تخاطب کے ذریعے دھیرے دھیرے حکیم صاحب کے مطب کے ماحول سے متعارف کراتے ہیں۔

"آپ نے شاید حکیم صاحب کو نہ دیکھا ہو۔ دیکھ لیجیے۔ آپ ایک شاندار مکان میں داخل ہوئے، یہی حکیم صاحب کا دارالشفا ہے۔ یہ سامنے وسیع صحن ہے، بہت سی کرسیاں اور بنچیں پڑی ہیں۔ بیچ میں ایک تخت ہے، اس پر دری بچھی ہے، اس پر قالین بچھا ہے، گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے، بڑے سلیقے اور قرینے سے قلم، دوات، کاغذ رکھا ہے۔ اتنے میں اندر سے ایک شاندار لحیم شحیم ہستی برآمد ہوئی ... الخ"

کتاب میں جا بجا ایسے دسیوں مرقعے مل جائیں گے جن میں چند ضروری جزئیات ہی کے ذریعے جعفری صاحب شخصیت کے خد و خال روشن کر دیتے ہیں اور اس طرح کہ قاری ان شخصیات کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان خاکوں میں مولانا عرفان، حیدر حسن خاں اور نیّر کاکوروی کے خاکے تو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والے شہ پارے ہیں۔ یہ تینوں خاکے ان شخصیات کے کامیاب ترین عکاس ہیں۔ ان شخصیتوں پر لکھتے ہوئے تو جعفری صاحب کا قلم عجب طرح کی گلکاریاں کرتا اور کلکاریاں مارتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان خاکوں میں ان شخصیات کے بعض بہت دلچسپ انوکھے پہلو سامنے آتے ہیں جن میں بچوں کی سی معصومیت اور بے تکلفی کے عناصر سرِفہرست ہیں،

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مثلاً کھانے کے وقت مولانا عرفان کی ترکتازیاں عجیب دلچسپ صورتِ حال پیدا کر دیتی تھیں۔ ندوہ کے مہتمم اور رئیس کے استاد مولانا حیدر حسن خان کا تعزیتی خاکہ زیرِ نظر کتاب کا طویل ترین اور کامیاب ترین خاکہ ہے اور اس سے استاد محترم کے ساتھ رئیس کی شوخیاں اور استادِ محترم کا سادگی سے ان کے دام میں گرفتار ہو کر رقت آفرینی کا سامان کرنا عجب طرح کا لطف دیتا ہے۔ اس خاکے سے حیدر حسن خاں کی بے نفسی، ایثار، اسلامیت، صداقت، تبحرِ علمی، وضعداری اور طنزیاتِ لطیف سبھی آئینہ ہو جاتی ہیں۔ رئیس نے یہ خاکہ اس طرح ڈوب کر لکھا ہے کہ حیدر حسن خاں کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس خاکے میں رئیس کی وقائع نگاری بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے جس سے خاکے کی کشش چہار گونہ بڑھ گئی ہے۔ اس خاکے کا وہ آخری اقتباس بھی دیکھتے چلیے جو اصل میں وداعِ جاوید کا منظر ہے۔ اس منظر میں ایمان، تیقن گداز اور درد نے کس قدر تاثیر پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً آخری دو سطروں میں حیدر حسن کی روحِ رواں سے جعفری صاحب کے تخاطب نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوبِ خاص کی یاد تازہ کر دی ہے۔ (واقعہ بھی یہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کا اسلوب مولانا دریابادی کے انداز و اسلوب سے خاصا متاثر نظر آتا ہے۔)

"بے شک یہ خاکی دنیا حیدر حسن خاں کے وجود سے محروم ہو گئی لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اس مردِ مومن کا استقبال دوسری دنیا میں کس شان سے ہو رہا ہے۔ اس دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آ کر وہ رسولؐ کا شارح اور مفسر، پیامبر اور داعی اس دنیا میں پہنچ چکا ہے جہاں نہ نوکری کی پابندیاں ہیں نہ دوسروں کے اشارۂ چشم و ابرو کا کچھ مفہوم ہے، نہ کوئی حاکم ہے، نہ کوئی محکوم، وہاں صرف رحمت ہے، ربوبیت ہے، شانِ مغفرت ہے جس کے جلو میں یہ نعائم موجود ہوں وہ رونے والوں کا دیدہ تر کیوں دیکھے؟

جا! اے بے قرار روح یثرب کے سرکار کے دربار میں جا۔ تیری خدمات مقبول ہوئیں، اس دربار میں ہمیشگی کی زندگی بسر کر، الوداع، الوداع!"

زیرِ نظر کتاب میں جعفری صاحب کا نقطۂ نظر ایک ہمدرد، غیر جانبدار اور بے لاگ شخصیت نگار کا ہے۔ وہ باطل کو باطل اور حق کو حق کہنے پر (بغیر لومۃ لائم)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مائل نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں طنز خال خال ہے اور تشنیع نہ ہونے کے برابر طنز عموماً تہ موج کی شکل میں محسوس ہوتا ہے مثلاً اسلم جیراجپوری کے بارے میں، جن سے ان کے منکرِ حدیث ہونے کی وجہ سے رئیس کا شدید اختلاف تھا، بغیر کسی تعصب کے صاف صاف لکھتے ہیں: "دل بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی ہے بلکہ اس میں ان "فنونِ لطیفہ" کی سرے سے گنجائش نہیں"۔ چند ایسے اور مزے کے چچے تُلے جملے سنیے، ایک دو جگہ رمز و رعایت نے بھی خوب لطف پیدا کیا ہے۔

ا۔ "دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے، جن کے خیالات گرانمایہ ہوتے ہیں وہ "بے زبان" ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شخص (مولانا آزاد سبحانی) اقلیمِ خیال کا بھی فرمانروا اور شہرستانِ زبان کا بھی تاجدار"۔

ب۔ "عوام کو دھڑکتے ہوئے دلوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، وجے لکشمی اور سید حسین کے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹ بھی دنیا کو یادگار رہ گئے"۔

ج۔ "اگر کسی سے محبت کرتے تو اسے اپنا ہمزاد بنا لیتے"۔ (بہ سلسلہ ڈاکٹر ضیاء الدین)

د۔ "علمی آدمی عام طور پر خلوت کے آدمی ہوتے ہیں، جلوت میں سرسبز نہیں ہو پاتے"۔

ر۔ "اختر پہلا شاعر ہے جس نے معشوق کے سبزۂ خط کو چھوڑ کر کاکل مشکیں کی طرف توجہ کی"۔

ہ۔ "آپ میں اور موت میں فی الحال اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا حق و باطل میں"۔

ز۔ "جب تک ان کی اُدکا سا (قوتِ مردمی کی دوا) ترقی کر رہی تھی انھوں نے (ڈاکٹر عبدالحمید خواجہ) نے جامعہ کو بھی بہت کچھ دیا اور دوسرے تعلیمی اداروں کی بھی جی کھول کر مدد کی۔ لیکن جب ترقی کی رفتار انتہا کو پہنچ گئی اور انھوں نے دوسرے منفعت بخش مشغلے بھی اختیار کر لیے تو ان میں امساک پیدا ہو گیا، اب نہ جامعہ پر نظرِ عنایت ہے نہ دوسرے تعلیمی اداروں پر"۔

ح۔ "ان (جگر) کی غزلیں عام و خاص سب کی زبان پر تھیں۔ بچے اُنھیں گاتے تھے، جوان ان سے لطف لیتے تھے۔ بوڑھے ان میں اپنی زندگی کا جلوہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

دیکھتے تھے، کالج کی لڑکیاں اُنھیں گنگناتیں تھیں اور بلند بام و بالا نشین خواتین ان کے کلام پر فدا تھیں۔"

ط۔ "رشید صاحب کی شوخ سنجیدگی یا سنجیدہ شوخی کے اہلِ نظر قائل تھے، شوخی پہلے ہو یا بعد میں لیکن تھی ان کے ادب کا ایک غیر منفک جزو۔"

رئیس کے ان خاکوں کے چراغ ماضی کی یاد آفرینی سے بھی روشن ہیں اور ان چراغوں کی لویں تیز کرنے میں ان کے استاد مولانا عرفان اور ان کے ممتاز ہم سبق عبدالسلام قدوائی ندوی متعدد بار ان اوراق میں آنکلتے ہیں، اور اپنی دلچسپ حرکات اور طور طریقوں سے ان میں رنگ بھرے جاتے ہیں، اور چونکہ ان خاکوں میں بیان کردہ عام شخصیات ایک خاص عہد میں زندہ تھیں، اس لیے ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ برِعظیم کی بیسویں صدی کے نصف اوّل کی معاشرت، تہذیب، ثقافت، تاریخی احوال، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، ادبی صورتِ حال اور مذہبی اور مسلکی تنوّع یا تنگ نظری بھی آئینہ ہوتی چلی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان خاکوں سے خود رئیس احمد جعفری کی اپنی شخصیت کے بعض ایسے اہم پہلو سامنے آتے ہیں جن کے جاننے کی اور کوئی صورت نہ تھی اور جن کی مدد سے خود ان کی شخصیت کا جیتا جاگتا اور ہنستا بولتا خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

رئیس کی خاکہ نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شخصیات زیرِ نظر کے ناموں کے تحت مختصر مگر چبھتے تلے الفاظ پر مشتمل ذیلی سرخیاں بھی قائم کرتے جاتے ہیں، یہ ذیلی سُرخیاں نثر میں یا کسی استاد کے مشہور مصرعے پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں بعض اوقات زیرِ بحث شخصیت کا جوہر کھنچ آتا ہے۔ مثلاً "مفتی اعظم سیّد امین الحسینی کے نام کے تحت ان کے خوبصورت چہرے، پُرکشش آنکھوں، گورے رنگ اور بے داغ کردار کے ناتے سے اقبال کے مشہور مصرع "یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل" کی سُرخی جمانا، ٹیونس کے مشہور مجاہد اور فرانسیسی استعمار کے بہت بڑے باغی علامہ ثعلبی کے ذکر میں "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" جیسی ذیلی سُرخی کا اندراج، مسز سروجنی نائیڈو کے روز بروز زوال آثار حسن و جمال کے پیشِ نظر "ہو گئے خاک انتہا یہ ہے" عطیہ فیضی کے ضمن میں "بلائے جاں ہے غالب

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اس کی ہر بات"، مولوی عبدالحق کی سفید، دودھیا طباشیر رنگ مگر انتھک پیری کی رعایت سے "جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب" قاضی عبدالغفار کے باب میں "ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں"، اور خواجہ کمال کے لیے "اک دلی پوشیدہ اور کافر کھلا"۔ جیسے برمحل مصرعوں اور مولانا ظفر علی خاں کے نام کے نیچے "تحریک بخد سے لے کر تحریک نیلی پوش تک"، مولانا اشرف علی تھانوی کے تحت "شریعت اور طریقت کا سنگم" اور مسٹر جناح کے تحت "بچے کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں" جیسے پُرمعنی اور مختصر کلمات کے اندراج سے ان کے خاکوں کے عنوان زیادہ جاذب، بامعنی اور جامع ہو گئے ہیں۔ پھر بعض جگہ خاکے کے وسط یا آخر میں محض ایک مصرعے کا اندراج وہی کام کر جاتا ہے جیسے ایک صاحبِ ایمان سپاہی کی تیغ کارِ سپاہ کر جاتی ہے۔ مثلاً مولانا عین القضاۃ کے نہایت مؤثر خاکے میں ان کے ایثار، گوشہ نشینی اور بے لوثی سے اشاعتِ اسلام کی کاوشوں کے ذکر میں بالآخر ان کے بیٹھے بیٹھے ایک خاص تاثر کے عالم میں رحلت کر جانے کے منظر کو رئیس نے ایک مشہور فارسی مصرعے "سبک بار مردم سبک تر روند" سے ٹانک کر اس ایک مصرعے کے ذریعے مولانا عین القضاۃ کا عین جوہر کھینچ لیا ہے اور زندگی بسر کرنے کے سلیقے سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔

زیرِ نظر خاکوں میں مفصل خاکوں کے دوش بدوش مختصر خاکے بھی ہیں۔ بعض خاکے تو محض بارانِ تحریر کے چند ہلکے چھینٹے ہیں جن سے ابرِ گہربار کی وسعت اور قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً حسرت موہانی وغیرہ کے خاکے۔ لیکن بعض خاکے بالکل سرسری اور چلتے ہوئے بھی ہیں۔ مثلاً آصف فیضی یا بھولا بھائی ڈیسائی کے خاکے۔ یہ اور اس قبیل کے چند اور لوگ محض چند لمحوں کے لیے پردۂ سیمیں پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر منظر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ خیر اس میں کوئی ایسا ہرج بھی نہیں، مشکل وہاں پڑتی ہے جہاں قاری رئیس کے زیرِ تحریر ممدوح یا شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کے بارے میں مزید جاننے کا آرزومند ہوتا ہے اور رئیس ایک شانِ بے نیازی سے خاکے کو ناتمام چھوڑ کر (کم از کم میرا احساس یہی ہے) آگے بڑھ جاتے ہیں مثلاً موسیٰ جار اللہ، ڈاکٹر جرمانوس اور گاندھی جی کے خاکے قاری کو ایک ایسے ہی دھچکے اور صدمے سے دوچار کرتے ہیں۔ لیکن ایک سو سے متجاوز خاکوں میں اس طرح کے خاکوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بعض خاکوں کے تکملے کے لیے قاری رئیس کی، مسلمانوں کی جدوجہد کی داستان پر مشتمل کتاب "کاروان گم گشتہ" میں شامل بعض خاکوں (مثلاً حسرت موہانی، گاندھی جی وغیرہ) سے رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہاں بعض شخصیات کے ضمن میں ایسے حقائق اور واقعات درج ہیں جو یوجوہ "دید و شنید" میں جگہ نہ پا سکے۔

رئیس نے ان خاکوں میں متعدد ایسی شخصیات کو بھی جگہ دی ہے جنھیں دنیائے علم و ادب فراموش کرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ عبدالرؤف عشرت، حکیم احمد علی اور حکیم کبیرالدین جیسے اہم لوگوں کو پردۂ خفا سے یا ان کے مخصوص حلقہ ہائے تعارف سے نکال کر رئیس نے ان کا ذکر اس چاہت، اپنائیت اور خلوص سے کیا ہے اور انھیں ادب کے ایسے وسیع میدان میں لے آئے ہیں کہ ان کی بازیافت خارج از امکان نہیں رہتی۔

رئیس احمد جعفری کا قلم تمام عمر اسلام اور خدمتِ اسلام کے لیے وقف رہا۔ ان خاکوں میں بھی انھوں نے اسلام ہی کی آفاقی قدروں کو ابھارا ہے چنانچہ اسلام دوست مجاہدین، شعرا، ادبا اور دانشوروں کے ذکر میں ان کا قلم خوب رواں ہو جاتا ہے۔ لیکن ان اوراق میں نہ تو کوئی بے آمیز شیطان ہے نہ کوئی خالص فرشتہ۔ رئیس نے اپنے کرداروں میں تدریج ارتقا اور قلب ماہیت کی خوبی سے نقش آرائی کی ہے۔ ان کا قلم تعصب سے اس قدر پاک ہے کہ وہ اپنی سادہ دلی کے ہاتھوں کمیونسٹ پارٹی کے بعض رہنماؤں کی بھی ضرورت سے زیادہ تعریف و اعتراف کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً پورن چند جوشی وغیرہ کے تدبر اور توازن کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی جانب سے تحریک پاکستان کی تائید پر خوب خوش ہوتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تخلیق پاکستان سے چند سال پہلے اشتراکی رہنماؤں کی جانب سے تحریک پاکستان کی حمایت ایک سوچی سمجھی اسکیم کا حصہ تھی۔ اشتراکی رہنماؤں کی بے نفسی اور مقصد سے ان کا اٹوٹ انسلاک لائق قابلِ تعریف سہی لیکن ظاہر ہے کہ اشتراکیت راحت کا جو راستہ بتاتی ہے وہ اعلیٰ روحانی و سماوی قدروں کو مٹا کر اور طبقاتی آویزش اور نفرت کے ذریعے ہی خریدی جا سکتی ہے۔ سجاد ظہیر رئیس کو بڑے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مقصد سے انسلاک اور کٹھنائیوں کی ہمت سے برداشت آدمی کو بڑا بناتی ہے لیکن اگر مقصد ہی پست اور یک رخا ہو تو؟

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ان مختصر معروضات کے اختتام سے پہلے زیرِ نظر اوراق میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے خاکے کے حوالے سے چند باتیں بھی ضروری ہیں۔ رئیس کے اس خاکے میں مولانا سے ان کی محبت اور عقیدت چھوٹی پڑتی ہے۔ ان کے دورِ الحاد کا ذکر کرتے ہوئے رئیس نے لکھا ہے کہ اُس زمانے میں ماجد مذہب سے منکر تھے۔ لیکن ان کی آزاد خیالی اور "ترقی پسندی" بھی اپنے اندر ایک اَن رکھتی تھی۔ اس میں بقول ان کے ایک وزن اور وقار تھا اور مذہب کا مذاق نہیں اُڑاتے تھے بلکہ اس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے۔ رئیس کی یہ بات محض جزواً درست ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتاب "فلسفۂ اجتماع" میں (جسے بعد ازاں انھوں نے اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا تھا) پیغمبرانِ عظام کے استخفاف اور دین کی تردید کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔ یہی معاملہ ان کی انگریزی تصنیف "PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP" کا بھی تھا۔ اسی طرح مولانا کے تجدید اسلام کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے رئیس نے خاتون منزل لکھنؤ میں ان سے اپنی ملاقات اور مشاہدات کا احوال لکھا ہے۔ اس ملاقات میں رئیس نے مولانا کے بازو کو زخمی پایا۔ سبب یہ تھا کہ مولانا نے بقول ان کے بچپن میں اپنے ہاتھ پر اپنا نام گدوا لیا تھا۔ اب تجدید اسلام کے بعد مذہبی کتب میں گدوانے کے خلاف مذہبی وعیدیں دیکھ کر انھوں نے اپنا نام مٹوانے اور کٹوانے کا فیصلہ کر لیا اور ڈاکٹر نے ایک انچ کے لمبے چوڑے حصے کو پوری کھال کھرچ کر صاف کر دیا۔ اس واقعے کے بیان میں رئیس صاحب سے دو تسامحات ہوئے ہیں، اوّل یہ کہ مولانا نے اپنے بازو پر اپنا نہیں اپنی منگیتر کا نام اُردو اور انگریزی میں کھدوا رکھا تھا اور دوم یہ کہ نام بچپن میں نہیں جوانی میں کھدوایا گیا تھا۔ مولانا نے اپنے خاکوں کے مجموعے "معاصرین" میں ڈاکٹر عبدالعلیٰ صاحب کے ذکر میں اس واقعے کی تفصیل رقم کی ہے۔

جوش پر لکھتے ہوئے رئیس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے کبھی حمد و نعت کا کوئی شعر نہیں کہا۔ یہ بات درست نہیں۔ ان کے ابتدائی مجموعوں خصوصاً "شعلہ و شبنم" میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں، جوش صاحب کے یہاں الحاد کی کمانی تو ابتدائی دو تین مجموعوں کی اشاعت کے بعد کھلی اور کھلتی ہی چلی گئی۔ آخر عمر میں وہ اپنی اصل کی طرف پلٹے اور سورۃ الرحمٰن کا جو منظوم ترجمہ انھوں نے کیا وہ ان کے حسنات میں یقیناً اضافے کا سبب

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بنے گا۔

بہزاد لکھنوی کے خاکے میں ایک جگہ انھوں نے مشہور شعر "بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔۔۔ الخ کو غالب سے منسوب کیا ہے۔ اس شعر کا اسلوب و انداز غالب کا نہیں۔ یہ متعین طور پر غالب کا نہیں آتش کا شعر ہے۔

رئیس کے زیرِ نظر خاکے مختلف شخصیات کے ہمہ گیر تنوع کے ساتھ رقم ہوئے ہیں۔ ان خاکوں سے جہاں شخصیات زیرِ قلم کے مزاج، میلان، رویّوں اور نظریوں کی وضاحت ہوتی ہے وہیں خود روحِ عصر کے ساتھ رئیس کے انسلاک کا بھی پتا چلتا ہے۔ رہا ان خاکوں میں حقائق کی تصدیق کا مسئلہ تو حقیقت یہ ہے کہ متعدد معاصر اور بعد کے خاکہ نگاروں، سوانح نگاروں اور شخصیہ نگاروں نے بہت سی انھیں شخصیتوں پر لکھا ہے جن پر رئیس نے قلم اٹھایا تھا اور اُن کے بیان کردہ حقائق و واقعات، رئیس کے بیان کردہ حقائق و واقعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ حقائق و واقعات نشاط خیز بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ ان اوراق میں بعض اکابر اور اعاظم کے احوال پڑھ کر میں نے بار بار اپنے آپ سے پوچھا، کیا میں ایسا بن سکتا ہوں؟

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نظرِ خوش گزرے!

اُردو زبان میں تراجم و سوانح کی کمی نہیں ملک و ملت کے رہنماؤں پر، دین و مذہب کے علمبرداروں پر، شعر و ادب کے ناخداؤں پر، زبان و بیان کے ماہروں پر، حکمت و فلسفہ کے اماموں پر، دولت و ثروت کے مالکوں پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے اس روشِ عام سے ہٹ کر یہ کتاب لکھی ہے اور صرف اپنے تاثرات و مشاہدات پر اکتفا کیا ہے، میں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ پایا، جو کچھ پرکھا، اسے برملا بیان کر دیا ہے اور حتی الامکان افراط و تفریط دونوں سے دامن بچایا ہے۔

زندگی میں میں نے بہت سے بڑے اور قابلِ ذکر آدمیوں کو دیکھا اور پرکھا، یہ کتاب اسی پرکھ اور نظارہ کی روداد پر مشتمل ہے۔ مجھے کسی سے عناد نہیں، لیکن اظہارِ تاثرات کے وقت میں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی ہے کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا شیفتگی پر۔ لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں میں نے وہی کہا اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے۔ سچ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خوشگوار ہو، کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ بھی آجاتی ہے، ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو کہیں تلخ۔ لیکن میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ سچ حدود کے باہر نہ نکلنے پائے۔

اردو زبان میں بعض کتابیں اشخاص و افراد سے متعلق شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ مصنف نے اپنے مزاحیہ رنگ میں اپنے چند دوستوں یا مخالفوں کا سراپا کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے اس پہلو سے اجتناب کیا ہے، میں نے اس کتاب میں انہی لوگوں کو لیا ہے جو ہندوستان میں یا دنیا میں کوئی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں یا جو زیادہ نامور نہیں، لیکن اپنی سیرت و شخصیت کے اعتبار سے اعاظم رجال میں شریک کیے جانے کے مستحق ہیں۔ یا جنہوں نے ایسی زندگی اختیار کر رکھی ہے جو لوگوں

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مفتی اعظم سیّد امین الحسینی

یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل

گورا رنگ بوٹا سا قد، سحر انگیز اور پرکشش آنکھیں خوبصورت چہرے پر بھُور ے بالوں کی خوبصورت داڑھی، مختصر اور دل آویز، تبسم دلنواز، باتیں دلفریب، دل اسلام کی محبت سے معمور، دماغ فلاح مسلمین کی اسکیموں سے بھرپور طبیعت، کفر کے غلبہ اور ابتلا سے رنجور آنکھیں اسلام اور مسلمانوں کے نشۂ کامیابی سے مخمور، خدائے ابراہیم و اسمٰعیل و محمد کی طرف سے تطہیرِ بیت المقدس کے جہاد کے لیے مامور،

یہ غریب الدیار مسافر مصر کے علوبہ پاشا کے ہمراہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آیا۔ امام بوہرہ ملّا طاہر سیف الدین کی دولت سرائے مالا بار ہل پر مقیم ہوا، فلسطین کے جہاد پیشہ اعراب کا بطل جلیل اور دنیائے اسلام کا یہ مجاہد کبیر محلّات و قصور میں رہنے کے بجائے آیا تھا، کام کرنے اپنی نوائے درد مسلمانانِ ہند کے کانوں تک پہنچانے، اپنا پیام درد قبلۂ اوّل کے عقیدتمندوں کو سنانے قیدِ فرنگ کو توڑنے اور غلبہ یہود کے سیل بے پناہ کو روکنے اس کام کے لیے اسے کسی اپنے ہی جیسے مجاہد کی ضرورت تھی۔ شوکت علی سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ گراں ڈیل اپنے دامن میں عالم اسلام کی اس قابلِ فخر کائنات کو اپنے غریب خانہ پر سمیٹ لایا۔

اب اسکیمیں خلافت ہاؤس میں بننے لگیں، ان اسکیموں کی تخلیق و تشکیل میں مفتی اعظم کی ذکاوت اور شوکت علی کی قوتِ عمل ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں، اسکیم یہ تھی کہ فلسطین کی قابل فروخت زمین کا بڑا حصّہ اپنے سرمایہ سے خرید کر ہندوستان کے مسلمان سرمایہ دار وہاں کارخانے کھولیں صنعتی ادارے قائم کریں تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے کے لیے بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں قائم کریں۔ جو نفع ہو چلا ہے تو اسے خود لے لیں مرضی ہو تو مجوزہ جامعہ فلسطین کے ارتقا اور

کے نزدیک قابلِ توجہ ہے ایسے لوگوں سے اگر میں ملا یا ایسے لوگوں کو اگر میں نے دیکھا تو ان کے کردار اور شخصیّت کی کون سی ادا مجھے یاد رہ گئی اور اس طرح یاد رہ گئی کہ دوسرے بھی اُسے سُنیں بس اسی کو میں نے بیان کر دیا۔

اس کتاب میں اکابر و اعاظم کی سوانح عمری نہیں ہے، لیکن ممتاز اور نمایاں لوگوں کی زندگی، کردار، شخصیّت اور اخلاق سے متعلق ایسے واقعات ضرور ہیں جو یاد رکھے جائیں، جن سے سبق حاصل کیا جائے، جنہیں زندگی کے سفر میں دلیلِ راہ بنا لیا جائے۔

اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو حوصلہ افزائی کی، ناکام ہوا ہوں، تو عفو اور چشم پوشی کی توقع رکھتا ہوں!

رئیس احمد جعفری

بمبئی:۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

احیاء پر صرف کرنے کے لیے وقف کر دیں میں اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کا تازہ وارد ایڈیٹر تھا اور مولانا شوکت علی کا ذاتی مددگار بھی۔ لہٰذا ان اسکیموں سے براہ راست واقفیت کے مواقع مجھے دوسرے کارکنان خلافت کے مقابلہ میں زیادہ حاصل تھے، مفتی صاحب اپنے ساتھ کچھ اپیلیں کچھ بیانات اور کچھ معلومات بھی لائے تھے یہ سارا لٹریچر عربی میں تھا اس کے ترجمہ کی خدمت مولانا شوکت علی مجھ سے لیتے تھے۔

مفتی اعظم کی تشریف آوری کے سلسلہ میں مسلمانان بمبئی کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسے کا اعلان ہوا جلسہ کا وقت قریب آگیا تھا، مفتی صاحب، علوبہ پاشا مولانا عرفان مرحوم اور مولانا شوکت علی جلسہ میں جانے کے لیے اٹھ رہے تھے کہ مفتی صاحب نے مولانا شوکت علی کو اپنے ایک بیان کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور خواہش ظاہر کی کہ یہ بیان بھی جلسہ میں ضرور پڑھا جائے، مولانا نے وہ مطبوعہ بیان میری طرف بڑھایا اور اپنے مخصوص لہجہ میں اپنے باوقار چہرے اور بڑے سر کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا۔ بہت کام ہے وقت بہت کم ہے۔ بیان بہت ضروری ہے فوراً اس کا ترجمہ کر دو! میں وہیں قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور پندرہ منٹ میں قلم برداشتہ ترجمہ میں نے پیش کر دیا۔ مولانا بہت جلدی میں تھے بغیر داد دیے ہوئے انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور اپنی آبنوسی چھڑی اٹھا کر نیچے اترنے کے لیے بڑھے۔ مفتی صاحب کو میری رفتار کار پسند آئی انہوں نے "احسنت! شاباش!" کہہ کر شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا، مولانا اتنی جلدی میں تھے کہ چلتے چلتے انہوں نے مفتی صاحب سے اردو میں گفتگو شروع کر دی "ہاں بڑا کام کا ہونہار لڑکا ہے" اور آگے بڑھ گئے

آج پہلی مرتبہ مفتی اعظم سے میری آنکھیں چار ہوئی تھیں، ان آنکھوں میں کیسی من موہن چمک تھی، عزیمت اور استقلال کی کیسی دل میں اتر جانے والی روشنی تھی یہ آج معلوم ہوا۔

فلسطین کی قابل فروخت زمین کے خریدنے کی خاطر سرمایہ جمع کرنے اور ملک کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد مرتب ہوا۔ جس میں سر سلیمان قاسم مٹھا جیسے لوگ تھے، وفد نے ابھی دورہ شروع نہیں کیا تھا کہ شملہ سے لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند نے مفتی اعظم کو دعوت ملاقات دی۔ لہٰذا انہیں فوراً شملہ تشریف لے جانا پڑا۔

پھر جب کام کا وقت آیا تو کام بالکل نہ ہو سکا، ظاہر ہے جس حکومت نے زبردستی فلسطین کو اپنا محکوم اور تابع بنا رکھا تھا جس نے بدعہدی اور وعدہ خلافی سے کام لے کر فلسطین

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پر اعلان بالفر مسلط کر دیا تھا جو اپنی قوت اور زور کے بل بوتے پر فلسطین کو وطن الیہود بنانے پر تلی ہوئی تھی وہ کیوں کر اسے گوارا کر سکتی تھی کہ فلسطین کی زمین مسلمانان ہند خرید لیں اور غریب یہودی سرمایہ دار منہ دیکھتے رہ جائیں حکومت کے ایما اور اشارہ کو مولانا شوکت علی ٹھکرا سکتے تھے۔ لیکن وہ لوگ تو نہیں ٹھکرا سکتے جنہوں نے اپنا "قبلہ و کعبہ" —— قبلۂ امید، اور کعبۂ آرزو —— سرکار ابد قرار کو بنا رکھا ہو، ——

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وفد نے کام شروع کیا نہ فلسطین کی زمین خریدی گئی نہ جامعہ فلسطین قائم ہوئی نہ وہاں کارخانے قائم ہو سکے۔ استعمار فرنگ کے یہ کارنامے دیکھتے دیکھتے ہماری آنکھیں عادی ہو چکی ہیں، لہٰذا ان میں کوئی قدرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

پھر مفتی اعظم اور اعراب فلسطین نے یہ محسوس کر کے کہ جو کچھ کرنا ہے انہی کو کرنا ہے خود ہی سب کچھ کیا۔ اور جو کچھ کیا اسے کوئی چرچل اور اٹلی کے دل حزیں سے پوچھے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

علامہ ثعلبی

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

۱۹۲۴ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لکھنؤ میں منعقد ہوا میں اس وقت ندوہ کے درجہ اوّل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن جلسہ کی شرکت کے شوق میں اپنے ہم سن طلبہ سے کہیں زیادہ آگے تھا۔

اس جلسہ میں ملک کے سربرآوردہ زعماء علماء اور اکابر بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے ان معزز مہمانوں میں ایک غیر ملکی شخصیت بھی تھی، یہ تھے ٹیونس کے مشہور مجاہد اور فرانسیسی سامراج کے بہت بڑے باغی علامہ ثعلبی!

جن لوگوں نے مولانا شوکت علی مرحوم کو دیکھا ہے وہ ان کے قد و قامت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے، ایک کرسی لاکر سامنے رکھ دی گئی اور اس پر بیٹھ کر شیر کی طرح گرجنا شروع کر دیا۔ تقریر عربی زبان میں ہو رہی تھی۔ پوری روانی اور تیزی کے ساتھ ہو رہی تھی حاضرین میں، اکثر عربی زبان سے ناواقف محض تھے، لیکن وفور تاثر کا یہ عالم تھا کہ ایک سکتہ سا چھایا ہوا تھا سارے مجمع پر، سوئی بھی پھینکیے تو اس کی آواز سن لیجئے سکون اور سکوت کا یہ عالم تھا، تقریر کیا تھی فصاحت و بلاغت جوش بیان اور زور کلام خطابت اور طلاقت لسانی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر تھا۔ ایک طوفان تھا۔ جس کی رو سب کچھ بہا جا رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا شوق عکاظ میں کوئی عرب خطیب اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہا ہے ایک ایک لفظ دل میں اتر رہا تھا۔ ایک ایک حرکت جنت دل کی ترجمان تھی دست و بازو کی ایک ایک جنبش شمشیر و تیر کا کام کر رہی تھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر جاری رہی اور مجمع دم بخود ان کی تقریر کو سنتا رہا، پھر مولانا عبدالرحمٰن گرامی مرحوم اٹھے اور انہوں نے اسی انداز بیان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اور اسی زور کلام کے ساتھ تقریر کا برجستہ ترجمہ کیا۔ اب وہ تقریر نہیں تھی مئے دو آتشہ تھی، جس کے نشہ سے غلاموں کے سر میں آزادی کا سودا پیدا ہو رہا تھا ایک سحر حلال تھا جس کے اثر سے مردوں میں زندگی کی تڑپ اور حرارت پیدا ہو رہی تھی، اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اقبال نے "نطق اعرابی" سے کیا مراد لیا تھا اور "نطق اعرابی" کی گیرائی، کیف تاثر، اور جوش کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میرے بچپن کا واقعہ ہے لیکن آج تک اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔

علامہ ثعلبی اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر ہندوستان میں پناہ گزین کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ پھر ان سے ایک عرصہ دراز تک ملاقات نہ ہو سکی، ۱۹۲۶ء میں ایک روز خلافت ہاؤس میں الحاج محمد علی زنیل علی رضا کے ہاں سے مولانا عرفان کے نام فون آیا کہ علامہ ثعلبی تشریف لائے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

مولانا فوراً تیار ہو گئے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا آج کے ثعلبی میں اور ۱۹۲۴ء کے ثعلبی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے، موٹا تازہ جسم گھل کر دبلا ہو چکا تھا وہ حرارت سرد ہو چکی تھی۔ پہلے وہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھے۔ اور اب صرف خاکستر ہو کر رہ گئے تھے۔ ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

آہ! غریب الوطنی اور جلاوطنی کے مصائب!

صبت علی مصائب لو انھا
صبت علی الایام صرن لیالیا

ڈاکٹر جرمانوس

ڈاکٹر ٹیگور اور شانتی نکیتن کی ایک یادگار تاریخ

ہنگری کے مشہور مستشرق ڈاکٹر جرمانوس کی بین الاقوامی قابلیت اور مہارت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۳۲ء میں تین سال کا معاہدہ کر کے ڈاکٹر جرمانوس کو شانتی نکیتن میں طلب کیا اور علوم مشرقیہ کی کرسی ان کے سپرد کر دی،

ڈاکٹر جرمانوس کے پہلو میں ایک تڑپتا ہوا دل تھا، وہ صحیح معنوں میں جویائے حقیقت تھے۔ مذہباً وہ عیسائی تھے۔ لیکن یہ مذہب ان کو تسکین نہ دے سکا۔ شاید اسی تحقیق حق کے جذبہ نے انہیں علوم مشرقیہ کا اسکالر بنا دیا اور تحقیق و تدقیق کی پوری شان کے ساتھ انہوں نے دوسرے مذاہب کو بھی جانچا اور پرکھا۔ لیکن ان کے دل کے لیے ان میں سے کوئی مذہب بھی پیام تسکین و تسلی نہ بن سکا۔

اپنے مطالعہ اور ریسرچ کے زمانہ میں انھوں نے اور مذاہب کے ساتھ ساتھ اسلام کا اسلامی تعلیمات کا، اسلام کے فلسفۂ حیات اور نظام زندگی کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ ہنگری کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے لیکن جہانیاں جہاں گشت بھی تھے انہوں نے اسپین کی سیاحت کی تھی اور وہاں "موریس" (مسلمانوں) کے غیر فانی نقوش بھی دیکھے تھے وہ مصر بھی جا چکے تھے اور وہاں ایک مٹی ہوئی قوم کے زندہ جاوید کارنامے ان کے سامنے تھے وہ ترکیہ کا سفر بھی کر چکے تھے، اور وہاں انہوں نے اس قوم کے دست بازو کے ساتھ اس کی تعمیرات اور صناعیوں کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اب وہ ہندوستان آئے تو یہاں بھی وہ نچلے نہ بیٹھ سکے، دلی کی جامع مسجد انہیں دعوت نظارہ دے رہی تھی، آگرہ کا تاج محل اور فتح پور سیکری کے باقیات الصالحات ان کا دامن دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے لاہور کی شاہی مسجد اور قلعہ شاہجہانی کے غیر مرئی نقوش بھی

ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے پہلی فرصت میں وہ شانتی نکیتن کے خلوت کدہ سے اُٹھے اور بلا وہند کے وہ نقوش ناتمام دیکھنے کے لیے چل کھڑے ہوئے جن کی کشش ایک عرصہ سے انہیں اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔

ہندوستان میں عہد اسلامی کی عمارتوں کو دیکھ کر بھی وہ بہت متاثر ہوئے، دلّی آئے تو خوش قسمتی سے ڈاکٹر انصاری تک اور وہاں سے جامعہ ملیہ کے ارباب کار تک ان کی رسائی ہوئی، جامعہ کے خاک نشینوں کا ماحول، طرز زندگی اور نظام معاشرت انہیں پسند آیا۔ وہ کافی دلچسپی جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ سے لینے لگے اور چند ہی ملاقاتوں میں انہوں نے کافی ربط و ضبط بڑھا لیا۔

اسلام سے وہ متاثر ہو چکے تھے اس سادہ اور فطری مذہب کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ زیادہ دیر تک اسلام سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ دلّی کے دوران قیام میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک روز جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ایک کے ہال میں جبکہ کوئی اہم جلسہ ہو رہا تھا انہوں نے اعلان کر دیا کہ آج سے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ شاہجہان اعظم کی جامع مسجد میں انہوں نے بڑے والہانہ جوش اور شیفتگی کے ساتھ جمعۃ الوداع میں شرکت کی۔

ان کی صورت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ گداز بدن، گورا رنگ گول چہرہ، چوڑی دار پائجامہ سرج کی ایک چست اچکن، ترکی ٹوپی، متبسم چہرہ، آنکھوں میں غور و فکر کی چمک، ادھیڑ عمر، اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ روز کے لیے وہ جامعہ میں ٹھہر گئے، عربی زبان تو وہ جانتے تھے۔ لیکن پھر بھی مطالعہ کے دوران میں بعض اشکال انہیں پیش آتے رہتے تھے۔ دوران قیام میں اس مرحلہ کو بھی انہوں نے طے کر لینا چاہا۔ میرے اور عبدالسلام صاحب قدوائی کے ذمہ یہ کام کیا گیا وہ عربی بولنے پر قادر نہیں تھے انگریزی بول لیتے تھے، لیکن اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھ مثلاً، کا تلفظ وہ ض سے کرتے تھے پہلے روز جب ہم دونوں ان کے کمرہ میں پہنچے تو جتنی مشکل ڈاکٹر صاحب کو عربی لٹریچر کے بعض مہمات کو حل کرنے میں پیش آ رہی تھی اس سے زیادہ مشکل ہمیں ان کی زبان اور انداز بیان کے سمجھنے میں پیش آتی۔ وہ ہمیں اپنی مشکل سمجھانا چاہتے تھے اور ہم انہیں اپنی مشکل سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

آخر یہ پہلی ملاقات ہر قسم کے اشاروں کنایوں کے باوجود "گاندھی جناح" ملاقات سے زیادہ ناکام ثابت ہوئی اور پھر ہم لوگوں نے ان کے کمرہ کا رخ نہیں کیا۔ کیونکہ منجملہ اور مشکلات کے سب سے بڑی مشکل ہنسی تھی جس کا ضبط کرنا ہمارے لیے تقریباً ناممکن تھا یہ وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں اصل بات یہ تھی کہ ہماری انگریزی بھی بہت کچی تھی۔ اس لیے انگریزی میں بے تکلف علمی گفتگو قطعاً ناممکن تھی عربی کی استعداد ٹھیک تھی لیکن نہ اتنی کہ ہم انہیں اپنا شاگرد بنا لیتے اور ایسی "عربی مبین" استعمال کرتے کہ ان کی استعداد اسے بآسانی فن کر لیتی۔

ڈاکٹر جرمانوس کے قبول اسلام کی خبر جب شانتی نکیتن میں پہنچی تو ایک کھلبلی مچ گئی اور تو اور خود گرودیو ڈاکٹر ٹیگور اس حادثہ کو خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت نہ کر سکے۔ اور اب وہی ڈاکٹر جرمان جنہیں خاص طور پر ہندوستان بلایا گیا تھا جنہیں گرودیو ٹیگور اور شانتی نکیتن کے دوسرے کارکن ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جن کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے قبول اسلام کے جرم میں معتوب و مقہور ہو گئے اب ان پر حقارت کی نظریں پڑنے لگیں وہ حیران تھے کہ جو ٹیگور انسانی اخوت کا عالمگیر برادری کا علمبردار ہو وہ عملاً اتنا تنگ دل نکلے کہ اپنی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا قبول اسلام برداشت نہ کر سکے پہلے اس کے چشم و ابرو پر بل پڑیں اور پھر وہ علانیہ دل کی بات زبان پر لے گئے۔ شانتی نکیتن کی اس تعصب پروری اور ڈاکٹر ٹیگور کی اس نارواداری ان تمام لوگوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ جو دل سے ڈاکٹر ٹیگور کے ثنا خواں اور شانتی نکیتن کے مداح تھے۔

بہر حال اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر جرمانوس نے اپنی مدت معاہدہ ختم ہو جانے سے پہلے استعفیٰ دے دیا جسے بڑی مستعدی بلکہ شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا گیا اور ایک روز وہ اپنے وطن ہنگری شانتی نکیتن کی اس مہمان نوازی اور ڈاکٹر ٹیگور کی اس اصول پروری کا ایک گہرا نقش لے کر روانہ ہو گئے۔

خالدہ ادیب خانم

تو آبروئے ملّتِ اسلام ہے

جامعہ ملیہ کے توسیعی لیکچروں کے سلسلہ میں خالدہ ادیب خانم ۱۹۳۵ء میں ہندوستان تشریف لائیں، چند روز کے لیے بمبئی میں بھی ٹھہریں۔

مجھے یہ نہیں یاد وہ بمبئی میں مقیم کس کے ہاں ہوئی تھیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ایک روز بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی نے اپنے مکان پر انہیں چائے کی دعوت دی اور چند مخصوص اصحاب کو بھی مدعو کیا۔ مولانا عرفان مرحوم مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

ہم لوگ ملاقات کے کمرے میں جاکر بیٹھ گئے، سید صاحب تشریف رکھتے تھے ان سے مختلف مسائل پر بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد خالدہ ادیب خانم تشریف لائیں، ان کے ساتھ مسز کملا دیوی چٹوپادھیا بھی تھیں۔

خالدہ ادیب خانم کا ذکر بچپن سے کانوں میں پڑتا رہا تھا، یہ وہ شیر دل عورت تھی جس نے ترکیہ کے انقلاب میں مردانہ وار حصہ لیا تھا، جس نے مصطفےٰ کمال پاشا کو کامیاب بنانے اور برسر اقتدار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا تھا۔ جو عورت تھی لیکن اپنے ملک کو آزاد کرانے اور پنجۂ اغیار سے چھڑانے کے سلسلہ میں اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے جن پر مردوں کو بھی فخر ہو سکتا ہے اور جو اب مصطفےٰ کمال کے استبداد و قہرمانیت کا ہدف بنی ہوئی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھی، جس نے ترکیہ کو آزاد کرایا تھا، لیکن آزاد ترکیہ کے دروازے اس کے لیے بند تھے۔ جس نے اپنے وطن عزیز کو انقلاب، جہاد اور بغاوت کے راستہ پر گامزن کیا تھا، لیکن جو آج وطن کی سرزمین پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی تھی، لیکن وہ آج بھی مصطفےٰ کمال کی تعریف میں

جملہ حقوق محفوظ ہیں

رطب اللسان تھی، اور اپنے وطن کا نام سنکر جس کا چہرہ آج بھی دمکنے لگتا تھا۔

گورا رنگ، میانہ قد، بڑی بڑی آنکھیں چہرے پر ضعیفی کی جھریاں، لیکن ان جھریوں میں بھی شباب رفتہ کا رنگ موجود، آواز لطیف اور شیریں، لیکن لب و لہجہ ایک سپاہی کی طرح فیصلہ کن اور باوقار پردہ سے آزاد، لیکن دل مذہب کا اسیر خیالات آزاد لیکن توازن کی دولت سے مالا مال، انداز کلام میں بے باکی، لیکن اس بے باکی میں بھی وقار نسوانی کی جھلک موجود۔

عرصہ سے پروپیگنڈہ ہو رہا تھا کہ ترک لامذہب ہیں، دہریے ہیں، انگریز بن چکے ہیں، لیکن آج آنکھوں کے سامنے جو ترک عورت بیٹھی تھی، وہ بیشک ہندوستان کے رواجی پردہ کی پابند نہ تھی، لیکن اس کی باتوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مذہب کی گرویدہ ہے اسے اپنے مذہب پر فخر ہے وہ دوسرے مذاہب کو بھی ٹٹول چکی ہے اور تلاش و تحقیق کے بعد وہ اسلام کو دنیا کا برترین مذہب سمجھتی ہے، اور اپنے اسلام پر اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتی ہے۔ وہ اس لیے مسلمان نہیں ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی وہ اس لیے مسلمان ہے کہ اس کا یہ یقین و اعتقاد ہے کہ اگر کوئی مذہب قبول کیا جا سکتا ہے تو وہ اسلام کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، اس کی یہ باتیں سنکر اس کے ان تاثرات سے واقف ہو کر دل خوش ہوا، پہلے سے جو ایک بدگمانی سی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔

مولانا عرفان نے پردہ اور اسلام کے بارے میں کچھ چبھتے ہوئے سوالات کئے، سوالات اس بنیاد پر کئے گئے تھے کہ آزاد ترکیہ کی ایک انقلاب انگیز عورت کہاں تک آگے بڑھ چکی ہے کہاں تک ترقی کے مراحل طے کر چکی ہے، اس نے بڑی سنجیدگی سے تمام سوالات کے جوابات دیئے۔ اور انداز جواب سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک اس کے "مسلمان" ہونے کا تعلق ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے یہ ضرور ہے کہ وہ رواجی پردہ کی نہ پابند ہے نہ اسے پسند کرتی ہے، وہ ایسی مسلمان عورتیں دیکھنا چاہتی ہے جو مشکیزے لے لے کر میدان جہاد میں غازیان تہور شعار کو پانی پلائیں، جو اسلام کے سرفروشوں کی مرہم پٹی کریں جو ملت اور مذہب کے لیے ہر تکلیف اور مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کریں۔ مولانا عرفان مجھ سے زیادہ بد اعتقاد اور بدظن ہو کر گئے تھے، لیکن مجھ سے زیادہ خوش اعتقادی اور حسن ظن کی دولت لے کر واپس آئے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اس ساری نشست میں گفتگو مولانا عرفان کرتے رہے، میں بالکل خاموش بیٹھا رہا مولانا نے خالدہ ادیب خانم اور کملا دیوی سے میرا تعارف پہلے ہی کرا دیا تھا "یہ روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر ہیں" مصافحہ کے بعد میں چپ چاپ بیٹھ گیا باتیں سنتا رہا۔ لیکن بحث و گفتگو میں میں نے کوئی حصہ نہیں لیا، میں دیکھ رہا تھا کملا دیوی کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی ہے لیکن کیوں؟ اس امر کو میں نہ سمجھ سکا۔

دوسرے روز خالدہ ادیب خانم سے متعلق کملا دیوی نے اپنے تاثرات ایک مقالہ کی صورت میں بمبئی کرانیکل میں شائع کرائے، جس میں اس محفل کا بھی ذکر تھا، اور اس محفل کے ذکر کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا "ایک جرنلسٹ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے لیکن اتنے شرمائے اور لجائے ہوئے کہ عورتوں کو بھی مات کر رہے تھے، کیا مجال ہے جو ایک لفظ بھی کئی گھنٹہ کی نشست میں انہوں نے اپنے منہ سے نکالا ہو، یا تو فی اخبار نویس تو میں نے بہت دیکھے ہیں، لیکن لب خاموش رکھنے والا یہ پہلا صحافی تھا جو میری نظر سے گذرا!"

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے!

میرے لیے یہ فخر بھی کافی تھا!

جملہ حقوق محفوظ ہیں

غازی رؤف پاشا

ایک مجاہد، ایک غازی، ایک مصلح

جامعہ میں داخلہ سے پہلے، ایک روز وطن میں بھائی صاحب (سید عقیل احمد جعفری) کی الماری کی تلاشی ان کی عدم موجودگی میں لیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار "الہلال" کی ایک جلد ہاتھ میں آگئی، میں اسے لایا اور پڑھنے لگا، اس فائل میں پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کے دوران حوادث پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تبصرے، مصور خبریں، اور مسلمانان ہند سے پرزور اپیلیں سطر سطر پر نظر کا دامن اپنی طرف کھینچتی رہیں۔

ورق گردانی کرتے کرتے بیچ صفحہ کی ایک تصویر پر نظر پڑی، یہ ایک جہاز تھا ترکی بیڑہ کا سرمایہ فخر و ناز حمیدیہ! اس جہاز کی کمان امیر البحر رؤف پاشا کے ہاتھ میں تھی، اور اس یگانہ روزگار امیر البحر نے اپنے اس چھوٹے سے جہاز سے بڑے بڑے کام لئے تھے کبھی یہ ڈوبا تھا کبھی اچھلا تھا، کبھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور کبھی گولے برساتا ہوا اور آگ کی بارش کرتا ہوا نمودار ہو گیا تھا، حمیدیہ جہاز اور ترکی بحریہ کا امیر البحر رؤف پاشا انگریزوں کے لیے ایٹم بم بنا ہوا تھا وہ رؤف اور حمیدیہ کا نام سنکر لرز جاتے تھے، ان کا بس چلتا تو ان دونوں کو سمندر کی تہہ میں غرق کر دیتے، الہلال میں نہایت تفصیل کے ساتھ حمیدیہ جہاز کے کارنامے اور رؤف پاشا کے کمالات حرب درج تھے، ترکوں سے عقیدت ہمیشہ سے تھی، لیکن رؤف پاشا نے اس عقیدت اور محبت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

مدت گذر گئی، پھر نہ حمیدیہ کا نام سننے میں آیا نہ رؤف پاشا کا، ترکیہ پر مصطفےٰ کمال پاشا آمریت کی پوری شان کے ساتھ حکومت کر رہے تھے اور جن مجاہدوں نے مصطفےٰ کمال کو مصطفےٰ کمال بنایا تھا، جنہوں نے ترکیہ کو مصیبت کے بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا تھا، جنہوں نے اتحادیوں کی غلامی سے ترکی قوم کو آزاد کرایا تھا، وہ اب مصطفےٰ کمال

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پاشا کے معتوب تھے اور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان جلاوطنوں میں بہت زیادہ ممتاز خالدہ ادیب خانم اور رؤف پاشا کی ہستیاں تھیں، رؤف پاشا پیرس میں مقیم تھے۔

آخر ۱۹۳۳ء میں دفعتاً ایک روز خبر گرم ہوئی کہ جامعہ میں لکچر دینے کے لیے غازی رؤف پاشا ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر تشریف لا رہے ہیں، اس خبر نے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی، حمیدیہ جہاز کا ہیرو، ترکیہ کے بحری بیڑہ کا سردار، ترکیہ جدید کا معمار ہندوستان آ رہا ہے، جامعہ کا مہمان بن رہا ہے، رؤف پاشا کے آنے سے پہلے تصور کے قلم نے اس مجاہد اور غازی کی دل نشیں تصویر کھینچ لی۔ کتنا بانکپن تھا اس تصویر میں!

آخر کار اشتیاق کی اندھیری رات ختم ہوئی اور صبح دید طلوع ہوئی رؤف پاشا آ گئے آج آنکھوں کے سامنے باہزاراں شان یکتائی دولربائی وہ مرد مجاہد کھڑا تھا جس کی تلوار نے اسلام کے دشمنوں کی گردنیں کاٹی تھیں جس کے مجاہدات نے فرنگی سامراج میں تزلزل پیدا کر دیا تھا، جس کے یادگار معرکوں نے لائڈ جارج اور چرچل کی نیند حرام کر دی تھی، تصور کی آنکھیں جما کر دیکھنا، یہ گورا گورا رنگ یہ بڑی بڑی آنکھیں! یہ بھرے بھرے بازو، اس مرد مجاہد کے ہیں جو میدان جنگ سے ہمیشہ سرخرو ہو کر لوٹا، دیکھ لو آج بھی اس کا چہرہ کتنا سرخ و سفید ہے سرخی ایسی ہے جیسے مجاہد کا خون، سفیدی ایسی جیسے فرشتہ کا دامن!

یہ وہ مجاہد ہے جس نے دشمنوں سے بھی جہاد کیا اور اپنے نفس سے بھی، جب فتوحات و مجاہدات کا ثمرہ لینے کا وقت آیا تو مصطفےٰ کمال نے اسے اپنا دست راست بنانے کے بجائے معزول اور جلاوطن کر دیا۔ اور خالد ابن ولید کی طرح چودھویں صدی کے اس مجاہد نے بھی بے چون و چرا ہتھیار ڈال دیئے اور رختِ سفر باندھ کر اپنے دیس سے ایک مسافر کی طرح نکل کھڑا ہوا، حالانکہ اگر چاہتا تو خون کی ندیاں بہا کر اپنا اقتدار قائم کرا سکتا تھا۔

رؤف پاشا نے کئی روز تک جامعہ کے ہال میں ترکیہ کے ماضی و حال پر سبق آموز معلومات افزا اور پُرمغز لکچر دیے، خدا کی قدرت ہے میدانِ جنگ کا سورما تقریر کے میدان اور تحریک و دوڑ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، خلقت مورد ملخ کی طرح اُمڈی پڑ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا ایک فوج ظفر موج کے سامنے اس کا محبوب کمانڈر کھڑا ہوا تقریر کر رہا ہے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

آغاز میں ہم کیا تھے، انجام میں ہم کیا ہیں؟

سنہ ۱۹۳۷ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی، میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پائجامہ، حیدرآبادی وضع کی شیروانی، داڑھی ندارد غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئی، انگریزی تراش کے بال خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے، میں نے مولانا عرفان سے پوچھا، آپکی تعریف؟ فرمایا، ابوالاعلیٰ مودودی،

اس نام کا مسمی آنکھوں کے لیے نیا تھا، لیکن کانوں کے لیے نیا نہ تھا، بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ کے افکار دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پہ بیٹھا ہوا تھا یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے "ترجمان الجمعیۃ" کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی اور اسے بام عروج پر پہنچایا، ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اوّل میں پہنچا دیا، سوامی شردھانند کے حادثہ قتل کے بعد جس نے "اسلام اور تشدد کا مسلک" اس موضوع پر اتنے عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی، مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہو گئے، اور اب عرصہ سے جس کی ادارت میں حیدرآباد سے رسالہ "ترجمان القرآن" نکل رہا تھا، جس کے مقالات اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ نظر اور اہلِ علم کے لیے باعث فخر و رشک ہو گئے تھے، باتیں کیں تو معلوم ہوا خدا نے ذہانت کے ساتھ ساتھ علم، گہرائی اور فکر، کی نعمت بھی عطا کی ہے، ابھی تک مولانا بڑے آدمی نہیں بنے تھے، دنیا سے بے نیاز بھی نہیں ہوئے تھے، حیدرآباد کے ایک حاکم با اختیار تک ——— ساحل بمبئی پر ——— جو ولایت سے آ رہا تھا ——— اپنے ایک عزیز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

علامہ موسیٰ جار اللہ

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

انقلاب روس کے طوفان میں صرف زار کا استبداد اس کی قہرمانیت اور اس کا وجود ہی خس و خاشاک کی طرح نہیں بہا، بلکہ اس ریلے میں بہت سے آبدار موتی، لعل و گوہر اور آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بھی۔

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

علامہ موسیٰ جار اللہ روس کے ان ارباب فضل و کمال اصحاب زہد و تقویٰ اور سند نشینان علم و فضل میں سے تھے، جن پر نہ صرف روس کو بلکہ عالم اسلام کو ناز تھا۔

امارات اور ریاست کی گود میں آنکھ کھولی، عیش و تنعم کے گہوارہ میں پروان چڑھے دولت و ثروت کے جلوس میں عرصۂ زندگی میں داخل ہوئے، وہ روس کے بہت بڑے جاگیرداروں میں تھے اور عیش و کامرانی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اس انقلاب نے اُن کی دنیا بدل دی وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور ہندوستان آکر پناہ گزیں ہو گئے۔

ترکیہ روس افغانستان ایران ممالک عربیہ اکثر مقامات کے لوگ ہندوستان مہمان بن کر آئے، یہاں سر آنکھوں پر بٹھائے گئے، پھر اُنہوں نے اپنی شخصیت اور اپنی آن کو ختم کر کے یا درویوزہ گری شروع کر دی یا سجادۂ معرفت بچھا کر بیٹھ گئے ہر صورت میں فائدہ رہے۔

لیکن اپنی آن اور شان کے اعتبار سے موسیٰ جار اللہ کی شخصیت ایک مخصوص انفرادیت کی حامل تھی، وہ ہندوستان اس حالت میں آئے کہ تہی دست اور بے نوا تھے ان کے قدرشناس اور مداح پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے، خود ان کے ہم وطن مسلمان بھی خاص تعداد میں موجود تھے، اور ان میں سے بعض کامیاب کاروبار کے مالک تھے اور دل میں ان کی عظمت اور عقیدت رکھتے تھے، لیکن کیا مجال ہے کہ اس گدائے متکبر نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہو، کسی کی امداد و اعانت قبول

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کی ہو، کسی کے خوانِ کرم کی ریزہ چینی کی ہو، فاقے کئے عسرت و فلاکت میں زندگی بسر کی۔ پھٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے، لیکن نہ کسی کے دستر خوان پر بیٹھا، نہ کسی کی جیب پر للچائی ہوئی نظر ڈالی۔

۱۹۴۲ء کے آغاز میں یہ خلافت کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، میرا خلافت سے تعلق منقطع ہو چکا تھا اور میں اپنا ذاتی اخبار روزنامہ "ہندوستان" نکال رہا تھا، مجگاؤں میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور وہیں مقیم تھا کہ بیمار ہوا، قطب صاحب خلافت ہاؤس کے مہمانخانہ میں مجھے اُٹھا لائے، میرا کمرہ اور علامہ موسیٰ جار اللہ کا کمرہ بالکل ملا ہوا تھا، اس طرح کئی ہفتے تک یکجائی رہی اور مجھے اُن کے دیکھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا۔

میں نے دیکھا یہ شخص صرف یہی نہیں کہ باغی دل و دماغ کا مالک ہے اپنے سینہ میں انقلاب اور تغیر کا طوفان پنہاں رکھتا ہے جس طرح مجلس علم کا بلبل خوشنوا ہے اسی طرح میدانِ کارزار کا سورما بھی ہے بلکہ عابد شب زندہ دار بھی ہے، ضعف اور کہولت سن کے باوجود نماز اس ذوق اور جوش و خروش سے پڑھتا ہے، جیسے اس کا کام نماز کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں اور وظائف کا سلسلہ بھی جاری ہے تہجد کی پابندی بھی ہے لیکن باہمہ اور بے ہمہ کیا مجال جو خلافت ہاؤس کا کھانا کبھی کھایا ہو، اگر جیب میں کچھ پیسے ہیں تو خود ہی ایک پتیلی پر اپنے کمرہ میں کچھ پکا رہے ہیں ایک کیتلی میں چائے گرم ہو رہی ہے اور اگر جیب خالی ہے تو پتیلی بھی سر بند رکھی ہوتی ہے اور کیتلی بھی، پھر حکومت ہند نے انہیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا ابھی حال میں رہا ہوئے ہیں۔

موسیٰ جار اللہ کے جو خیالات روس کے بارے میں ہیں اُن سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کے تقدس، حسن نیت اور بے لوثی سے انکار نہیں ہو سکتا۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ابوالکلام آزاد

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اُردو کی پسماندہ صحافت میں الہلال نکال کر ابوالکلام نے ایک نئے شاندار اور یادگار دور کا آغاز کیا، الہلال کے ساتھ ابوالکلام کا طرزِ انشا بھی اتنا انوکھا اور نرالا تھا کہ جو سمجھ گیا اس نے بھی داد دی اور جو نہ سمجھ سکا داد دینے پر وہ بھی مجبور ہو گیا۔

۱۹۲۴ء میں کہ میں ندوہ کی ابتدائی جماعت کا ایک طالب علم تھا، علی برادران کے ساتھ ابوالکلام بھی لکھنؤ آئے، رات کو رفاہِ عام کے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ مسلمانانِ لکھنؤ کا منعقد ہوا، ندوہ سے کئی طالب علم جلسہ کی شرکت کے لیے گئے ہیں بھی ساتھ ہو لیا، بڑی دیر تک مولانا کی تقریر ہوتی رہی مگر میری سمجھ میں کچھ خاک نہ آیا، گھر میں بچپن سے ابوالکلام کا ذکر عقیدت و عظمت کے ساتھ سنتا چلا آ رہا تھا، میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد صاحب جعفری تو ابوالکلام کے پرستاروں میں تھے، اسی "پروپیگنڈہ" کا اثر تھا میں رفاہِ عام کے جلسہ میں چلا گیا، لیکن جا کر پچھتایا کہ نہ معلوم یہ اتنے مشہور کیوں ہیں؟

اگست ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی مشہورِ زمانہ نہرو رپورٹ قیصر باغ کی بارہ دری (لکھنؤ) میں پیش ہوئی، ندوہ کے طلبہ، قومی معاملات میں عملی حصہ لینے کے خوگر تھے۔ اور مقامی قومی کارکن قومی تقریبات کے مواقع پر ان کے جذبات سے فائدہ اُٹھانے کے عادی تھے، اس آل پارٹیز کانفرنس کے سلسلہ میں بھی ندوہ سے رضاکاروں کی طلبی ہوئی، ندوی رضاکاروں کے دستہ کا ایک فرد میں بھی تھا۔

میرے ذمہ ڈیوٹی یہ تھی، کہ چند رضاکاروں کے ساتھ چارباغ اسٹیشن پر موجود رہوں، اور جو زعمائے قوم اور رہنمایانِ ملت تشریف لائیں انہیں منزلِ مقصود تک

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پہنچانے کے انتظام میں اپنے سردار کا ہاتھ بٹاؤں۔

ہر ٹرین پر دس پانچ معمولی اور دو چار بڑے "لیڈر" تشریف لاتے رہتے تھے کوئی ٹیلر پیلس میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا ذاتی مہمان ہے، کوئی ٹھاکر نواب علی کے "قصر فلک نما" کو اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہے، آخری ٹرین سے مولانا ابوالکلام تشریف لائے، آپ کی پیشوائی کیلئے ہم معمولی رضا کاروں کے علاوہ چند سر برآوردہ شخصیتیں بھی پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھیں، مہاراجہ محمود آباد کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر سعید الرحمٰن قدوائی موجود تھے اور ندوہ کے ارباب انتظام کی طرف سے نواب علی حسن خاں ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے بڑے صاحبزادے امیر حسن صاحب کو بھیجا تھا لیکن مولانا نے دونوں دعوتیں بڑی خندہ پیشانی اور وسعت قلب کے ساتھ مسترد کر دیں، اُنھوں نے فرمایا، میرے بھائی یہ سچ ہے آپ مجھے اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں، لیکن مجھے آرام ہوٹل ہی میں ملے گا، قبل اس کے کہ سعید الرحمٰن صاحب یا امیر حسن صاحب مزید اصرار فرمائیں، مولانا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر محمد جان کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو چکے تھے، ان دونوں میزبانوں کی حالت اس وقت قابل دید تھی۔

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

میں نے سوچا یہ کیسا اکل کھرا لیڈر ہے جو مہاراجہ اور نواب جیسے جلیل القدر میزبانوں تک کی دعوت پوری شان استغنا کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے ـــــ عجیب شخص ہے!

پھر یہ دیکھا کہ آل پارٹیز کانفرنس کے ایوان زرنگار میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں، کبھی بپن چندر گوپال گرج رہے ہیں، کبھی مسٹر اینی بسنٹ کی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا لیڈر اپنی گرمئ گفتار کے کمالات دکھا رہا ہے، لیکن ابوالکلام صاحب ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں، پرائیویٹ مجلسوں میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، لیکن جلسہ عام میں مہر بہ لب،

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بعض لوگوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے اس اجتماع کو مجلس مشاعرہ اور نہرو رپورٹ کو اس کا مصرعہ طرح سمجھ کر مولانا سے بھی طبع آزمائی کی درخواست کی، لیکن مولانا نے انکار فرمادیا، میرے بھائی تقریریں کافی ہو چکیں کسی مزید تقریر کی کیا ضرورت ہے؟" مہاراجہ محمود آباد پاس بیٹھے تھے، اُنہوں نے بھی بڑا اصرار کیا، اب مولانا نے زبان کے بجائے صرف گردن سے جواب دینا شروع کیا۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

میں رضا کار کی حیثیت سے ڈائس کے قریب کھڑا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، حیرت اس پر تھی کہ یہ شخص مہاراجہ کے اصرار کو بھی خاطر میں نہیں لایا، جن کی شاعرانہ تعریف مسز سروجنی نائیڈو تک نے اپنی لچھے دار تقریر میں کر ڈالی ——— خوب ادائیں ہیں اس لیڈر کی بھی! زمانہ اور آگے نکل گیا!

۱۹۳۲ء میں مولانا دہلی آئے، میں بھی اس زمانہ میں دہلی میں تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، معلوم ہوا مولانا کچھ روز دہلی ہی میں بسر کریں گے دریا گنج میں اُنہوں نے عرصہ سے ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی، اسی میں یہ مقیم تھے، لق و دق کوٹھی خود بدولت اور دو ملازم یہ تھے اس وسیع مکان کے مکین۔

اپنے دوست عبدالسلام قدوائی کے ساتھ میں روانہ ہوا، ہم دونوں پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم مسز ارونا آصف علی کے ساتھ پہنچ گئے، ہمارے لیے حاجب و دربان کی پابندی تھی، اذنِ باریابی کی ضرورت تھی، یہ دونوں ان رسمیات سے بالا تھے، ہم ملازم سے التجا کر رہے تھے کہ مولانا کو اطلاع کر دے وہ ابھی ہماری اس التجا پر اپنا فیصلہ نہ صادر کر پایا تھا کہ یہ دونوں لیڈر آئے اور دَرّاتے ہوئے اندر چلے گئے اور اس طرح کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے آخر ہم لوگ واپس آ گئے۔

از در یار چہ گویم بہ چہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

یہ زمانہ تھا کہ میں مولانا کے افکار سیاسی سے سخت بیزار تھا، لیکن الہلال، البلاغ اور تذکرہ پڑھ چکا تھا، ان کی قابلیت ذہانت اور بڑائی کا سکہ اختلافِ فکر و نظر کے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پہنچانے کے انتظام میں اپنے سردار کا ہاتھ بٹاؤں۔

ہر ٹرین پر دس پانچ معمولی اور دو چار بڑے "لیڈر" تشریف لاتے رہتے تھے کوئی ٹیلر پیلس میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا ذاتی مہمان ہے، کوئی ٹھاکر نواب علی کے "قصر فلک نما" کو اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہے، آخری ٹرین سے مولانا ابوالکلام تشریف لائے، آپ کی پیشوائی کیلئے ہم معمولی رضا کاروں کے علاوہ چند سربرآوردہ شخصیتیں بھی پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھیں، مہاراجہ محمود آباد کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر سعید الرحمن قدوائی موجود تھے اور ندوہ کے ارباب انتظام کی طرف سے نواب علی حسن خاں ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے بڑے صاحبزادے امیر حسن صاحب کو بھیجا تھا لیکن مولانا نے دونوں دعوتیں بڑی خندہ پیشانی اور وسعت قلب کے ساتھ مسترد کر دیں، انہوں نے فرمایا، میرے بھائی یہ سچ ہے آپ مجھے اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں، لیکن مجھے آرام ہوٹل ہی میں ملے گا، قبل اس کے کہ سعید الرحمن صاحب یا امیر حسن صاحب مزید اصرار فرمائیں، مولانا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر محمد جان کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو چکے تھے، ان دونوں میزبانوں کی حالت اس وقت قابل دید تھی۔

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

میں نے سوچا یہ کیسا اکل کھرا لیڈر ہے جو مہاراجہ اور نواب جیسے جلیل القدر میزبانوں تک کی دعوت پوری شان استغنا کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے ـــــ عجیب شخص ہے!

پھر یہ دیکھا کہ آل پارٹیز کانفرنس کے ایوان زرنگار میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں، کبھی بپن چندر گوپال گرج رہے ہیں۔ کبھی مسٹر اینے لسنبٹ کی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا لیڈر اپنی گرمئ گفتار کے کمالات دکھا رہا ہے، لیکن ابوالکلام صاحب ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں، پرائیویٹ مجلسوں میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، لیکن جلسہ عام میں مہر بہ لب،

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بعض لوگوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے اس اجتماع کو مجلس مشاعرہ اور نہرو رپورٹ کو اس کا مصرعہ طرح سمجھ کر مولانا سے بھی طبع آزمائی کی درخواست کی، لیکن مولانا نے انکار فرما دیا، میرے بھائی تقریریں کافی ہو چکیں کسی مزید تقریر کی کیا ضرورت ہے؟ مہاراجہ محمود آباد پاس بیٹھے تھے، انہوں نے بھی بڑا اصرار کیا، اب مولانا نے زبان کے بجائے صرف گردن سے جواب دینا شروع کیا۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

میں رضا کار کی حیثیت سے ڈائس کے قریب کھڑا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، حیرت اس پر تھی کہ یہ شخص مہاراجہ کے اصرار کو بھی خاطر میں نہیں لایا، جن کی شاعرانہ تعریف مسز سروجنی نائیڈو تک نے اپنی لچھے دار تقریر میں کر ڈالی _____ خوب ادائیں ہیں اس لیڈر کی بھی! زمانہ اور آگے نکل گیا!

۱۹۳۲ء میں مولانا دہلی آئے، میں بھی اس زمانہ میں دہلی میں تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا معلوم ہوا مولانا کچھ روز دہلی ہی میں بسر کریں گے دریا گنج میں انہوں نے عرصہ سے ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی، اسی میں یہ مقیم تھے، اق ودق کوٹھی خود بدولت اور دو ملازم یہ تھے اس وسیع مکان کے مکین۔

اپنے دوست عبدالسلام قدوائی کے ساتھ میں روانہ ہوا، ہم دونوں پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم مسز اروناآصف علی کے ساتھ پہنچ گئے، ہمارے لیے حاجب و دربان کی پابندی تھی، اذن باریابی کی ضرورت تھی، یہ دونوں ان رسمیات سے بالا تھے، ہم ملازم سے التجا کر رہے تھے کہ مولانا کو اطلاع کر دے وہ ابھی ہماری اس التجا پر اپنا فیصلہ نہ صادر کر پایا تھا کہ یہ دونوں لیڈر آئے اور دراتے ہوئے اندر چلے گئے اور اس طرح کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے آخر ہم لوگ واپس آ گئے۔

از در یار چہ گویم بہ چہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

یہ زمانہ تھا کہ میں مولانا کے افکار سیاسی سے سخت بیزار تھا، لیکن الہلال، البلاغ اور تذکرہ پڑھ چکا تھا، ان کی قابلیت ذہانت اور بڑائی کا سکہ اختلاف فکر و نظر کے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باوجود دل پر بیٹھ چکا تھا۔

چند روز بعد ہم دونوں پھر پہنچے، آج زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا، ملازم بھی سمجھ گیا شاید کہ مستقل مزاج لوگ ہیں، درشن کئے بغیر واپس نہ جائیں گے، اس نے ہمیں لائبریری میں بٹھایا، اور خود اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پردہ اٹھا اور مولانا نمودار ہوئے، بڑی شفقت اور مرحمت کے ساتھ ہم نیازمندوں کے ساتھ پیش آئے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا، کیا وجہ ہے کہ مؤطا امام مالک "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ" نہیں مانی جاتی اور بخاری مانی جاتی ہے، حالانکہ امام مالک زمانی اعتبار سے بھی امام بخاری کے مقابلہ میں رسول اللہ سے اقرب تھے؟ اور بخاری کے رواۃ کا وہ درجہ اصحاب خبر کے نزدیک نہیں جو مؤطا کے رواۃ کا ہے، اس سلسلہ رواۃ کو تو "سلسلۃ الذہب" کہا جاتا ہے؟ مولانا غور سے میرے معروضات سنتے رہے، پھر فرمایا آپ جو کچھ کہتے ہیں، صحیح ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ مؤطا درسی کتاب نہیں ہے، علاوہ ازیں اس میں زیادہ تر آثار ہیں نہ کہ اقوال و احکام اور بخاری زیادہ تر اقوال و احکام پر مشتمل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صدیوں سے نصاب درس میں داخل ہے اس کی ایک ایک حدیث اور ایک ایک روایت ہزاروں لاکھوں بار جانچی اور پرکھی جا چکی ہے، پھر ایک محویت کے ساتھ فرمایا "سچ کہا تھا ابن حجر نے بخاری کا اُمت پر قرض ہے اور وہ قرض آجتک باقی ہے" یہ جملہ بار بار مولانا نے دہرایا "قرض" کے لفظ پر خاص زور دیتے تھے۔

میں نے دوسرا سوال کیا، سارق کے قطع ید کی مصلحت کے بارے میں اس سوال کو بھی مولانا نے غور سے سنا، پھر فرمایا، اسلام بجائے خود ایک نظام ہے اور یہ نظام اپنے تمام جزئیات کے ساتھ ہی بروئے کار آسکتا ہے، آج اگر زانی کو سنگسار کر دیا جائے، چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو یہ ظلم ہوگا، لیکن اگر اسلام کا نظام برسر عمل ہو، ایسی سہولتیں مہیا کر دی جائیں کہ فطرت صحیح چوری یا زنا کی طرف مائل ہی نہ ہو سکے، اور پھر بھی کوئی شخص زنا کرے یا چوری کا مرتکب ہو، تو یقیناً وہ اس کا مستحق ہے، کہ اسے عبرت انگیز سزا دی جائے۔

اس جواب سے اندازہ ہوا کہ سیاسیات کے کانٹوں سے اپنا دامن الجھانے کے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باوجود یہ شخص اپنے اصل موضوع، اسلامیات پر اتنی ہی گہری نظر رکھتا ہے جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔

آخر میں ایک سوال اشتراکیت کی "حلت و حرمت" کے بارے میں قدوائی صاحب نے کیا، جواب ملا، "یہ ایک تجربہ ہے اور یہ تحریک جب تک تجربہ کے دور سے نہ گزرے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

اب مغرب کا وقت ہو چکا تھا، ہم نے اجازت چاہی اور واپس چلے آئے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کی سفارش پہنچا نے تشریف لائے تھے، لیکن باتوں میں، لب و لہجہ میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا، بے موقع تبسم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں، خلا ملا سے پرہیز تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی اور خاموشی، بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں اور مولانا ان سے پورے طور پر مسلح تھے۔

کئی روز تک مولانا مقیم رہے اور اس عرصہ میں کئی بار آپس میں گفتگو ہوئی شام کو مولانا عرفان نے حسب عادت موٹر گیرج سے نکالی، وہ ڈرائیو کر رہے تھے اور میں اور مولانا مصروف تکلم تھے، سارے شہر کی سیر کر ڈالی لیکن گفتگو کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، مولانا نے سینما دیکھنے کی دعوت دی جسے ہمارے مہمان نے ایک بے نیازی کے ساتھ مسترد کر دیا، دوران قیام میں کئی آدمی ترجمان القرآن کے خریدار مولانا عرفان کی کنوسنگ سے بنے، جن میں صدر خلافت سید مرتضیٰ بہادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا نے خلافت کے تبادلہ کو کہا میں نے منظور کر لیا، ترجمان القرآن کے مکمل فائل دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، حیدرآباد پہنچتے ہی تمام پرچے بغیر کسی یاددہانی کے بھیج دیئے، بس یہ ایک ایسی بات تھی جو بڑے پن کے منافی تھی۔

مولانا کے واپس جانے کے بعد ایک روز مولانا عرفان سے ان کا تذکرہ چھیڑا، میں نے کہا مولانا کی قابلیت، ذہانت، بالغ نظری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن جیسا باطن ہے ظاہر ویسا نہیں ہے، یہ بات ذرا دل کو کھٹکتی ہے، مولانا نے فرمایا جس نے باطن بدل دیا ہے وہ ظاہر کے بدل دینے پر بھی قادر ہے اور میاں اصل چیز تو باطن ہی ہے، ظاہر میں کیا رکھا ہے، میں اس دلیل سے لاجواب ہو گیا۔

لیکن رفتہ رفتہ میرے دل کی کھٹک دور ہوتی گئی، قرآن کے اس ترجمان اور اسلام کے اس شارح اور پیامبر پر اسلام کا رنگ چڑھتا چلا جا رہا تھا، اور بہت جلد یہ نوبت پہنچ گئی کہ وہ شروع سے آخر تک "صبغۃ اللہ" میں رنگ گیا، اور اس رنگ سے بہتر اور چوکھا رنگ نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اور آج یہ عالم ہے، کہ ابوالاعلیٰ کے نظریات اسلامی اور تصورات دینی سے سنجیدہ اور مدلل اختلاف رکھنے والے متعدد بزرگ ملیں گے، لیکن اس کی اسلامیت پر حرف گیری کرنے والا اس کا بدترین دشمن بھی نہیں، کیوں نہ ہو، خدا کی دین ہے وہ چاہے تو انسان کا ظاہر اور باطن سب کچھ بدل دے سکتا ہے!"

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مولانا آزاد سبحانی

ایک بلند پایہ مقرر ایک یگانۂ روزگار خطیب

مسجد کانپور کے حادثۂ انہدام کے سلسلہ میں مولانا آزاد سبحانی شہرت کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی برطرفی کے بعد کلکتہ کی امامت عیدتک شہرت اور ناموری کے بہت سے مراحل خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے طے کر لیے، تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں، تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں، بہت بڑے فلسفی بھی ہیں تقریر میں فلسفیانہ تخیل وتجزی کے کمالات اور دلائل قاطعہ وبراہین ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ندوہ کی مجلس میلاد انہوں نے پڑھی تھی، مولانا ظفر الملک علوی کے خیالات ہیں اور ان کے خیالات ہیں ہمیشہ بعد المشرقین رہا ہے۔ لیکن وہ خاص طور پر سائیکل پر سوار ہو کر محض ان کی تقریر سننے آئے تھے اور آخر وقت تک نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنتے رہے تھے، ایک دوست نے، پوچھا آپ خلاف معمول کیسے تشریف لے آئے، فرمایا صرف مولانا آزاد سبحانی کی تقریر سننے!

میں جب جامعہ میں داخل ہوا تو مولانا آزاد سبحانی کی "گارڈھا تحریک" اور "حکومت ربانیہ" کی تحریک زور شور سے جاری تھی، مولانا کے صاحبزادے بھی جامعہ میں پڑھتے تھے، اس وجہ سے اکثر مولانا جامعہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا کرتے تھے جب آتے تھے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو شرف عطا کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنا مہمان بنائیں اور وہ بڑی خوشی سے یہ سعادت حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔

ایک بار مولانا جامعہ تشریف لائے میں انجمن اتحاد کا نائب صدر تھا بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ مولانا کو تقریر کی دعوت دی جائے، میں ذاکر صاحب کی کوٹھی پہنچا ایک

چارپائی پر لیٹے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے ہیں نے تقریر کی دعوت دی فلسفیانہ استغراق و تامل کے بعد قبول فرمائی گئی، طے پایا کہ رات کو تقریر فرمائیں گے۔

محمد علی ہوسٹل میں تقریر کا انتظام ہوا، حاضرین مولانا کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے کہ وفعتاً کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی مسلسل آوازیں آنا شروع ہوئیں، نظر اٹھائی تو مولانا کھٹ پٹی پہنے ہوئے خراماں خراماں مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں، گاڑھے کا ایک تہ بند زیب بر، تہ بند کا باقی حصہ رونق دوش و سر، بال کمتر سیاہ زیادہ تر سفید، لیکن سفیدی دودھ کی سفیدی نہ تھی، اس پر خاکساری کا رنگ غالب تھا، ہم میں سے بہتوں نے سمجھا مولانا کے لیے موزوں تر جگہ اسٹیج کے بجائے خانقاہ ہو سکتی تھی یا کسی مسجد کی کوٹھری شاید مولانا نے یہ بات بھانپ لی، مسکراتے ہوئے اٹھے اور تبسم کے ساتھ تقریر شروع فرمائی، یہ بے موقع تبسم بھی ناگوار گزر رہا تھا، جی چاہتا تھا اس تبسم کا جواب قہقہہ سے دیں۔

اب مولانا کی تقریر شروع ہو چکی تھی، ڈھلے ہوئے فقرے، موزوں اور مناسب الفاظ، چست اور معنی خیز جملے، صاف اور شیریں زبان، واضح اور نشین بیان خیالات زبان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، زبان خیال بلند پرواز کی بلندیوں پر روپوش دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے، جن کے خیالات گرانمایہ ہوتے ہیں وہ "بے زبان" ہوتے ہیں لیکن یہ شخص اقلیم خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستان زبان کا بھی تاجدار، کیا خدا کی قدرت ہے، صورت دیکھیے تو ہیچ میرز باتیں سنئے تو معلوم ہو شاعر نے یہ شعر انہی کے لئے کہا ہے ؎

مبیں حقیر گدایان قوم را کیں قوم
شہانِ بے کرد خسروان بے کلہ اند

مولانا اسلم جیراج پوری

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

بلند پایہ عالم ہیں، تاریخ اسلام پر وسیع نظر رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں لیکن تاریخ الامت بہت مشہور و مقبول ہے، پہلے علی گڑھ کالج میں اسلامیات کے معلم تھے پھر جامعہ ملیہ کی تاسیس ہوئی، علی گڑھ کی آرام دہ نوکری چھوڑ دی اور جامعہ کے غریب خانہ میں آکر بیٹھ گئے، جامعہ پر بڑے بڑے نازک وقت آئے لیکن اس ادارے سے ان کی وفاداری کبھی متزلزل نہ ہوئی۔

مسلک اہل قرآن کے تابع ہیں، قدرتاً حدیث کو حجت نہیں مانتے ان کے نزدیک وہی حدیث ہے جس کی عمل متواتر سے تائید ہو، مسلک کے صواب و خطا سے بحث نہیں لیکن ان کی مذہبیت، صداقت، دیانت اور دینی حمیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ نماز بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں اور حتی الامکان باجماعت اپنے مسلک پر سختی سے قائم ہیں، لیکن اس موضوع پر گفتگو اسی سے کرتے ہیں جو خود کرنا چاہے، ورنہ خاموش رہتے ہیں۔

دل، بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی ہے بلکہ اس میں ان "فنون لطیفہ" کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔

برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست!

جس زمانہ میں مولانا حدیث کی مذہبی حیثیت کے خلاف مقالات تحریر فرما رہے تھے میں نے کئی مقالے ان کے جواب میں لکھے، مولانا خود بھی رسالہ جامعہ کے ایک مدیر تھے انہوں نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ انہیں جامعہ میں شائع کیا اور کبھی ایک لفظ البسا نہیں کہا جس سے یہ اندازہ ہو کہ برہم ہیں، کبھی ایک بات ایسی نہیں کی جس سے یہ شبہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ہو کہ ناراض ہیں، شفقت و عنایت کا جو سلوک جامعہ میں میرے داخل ہونے کے روز تھا بالکل یہی سلوک اس وقت بھی تھا جب میں تیز و تند لہجہ میں ان کے مقالات کے خلاف مقالات لکھ رہا تھا صرف یہی نہیں اس وقت بھی اور اس وقت کے بعد بھی اگر کوئی موقع آیا تو انہوں نے میرے حق میں کلمہ خیر کہے، اور اخلاقی امداد پہنچانے سے ذرا بھی دریغ نہیں کیا، سچ تو یہ ہے کہ مولانا کے اس کردار نے میرے دل پر ایک ایسا نقش بٹھا دیا ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

مولانا عربی ادب پر بھی بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں اور فارسی ادب کے ماہر بھی ہیں ہنگامہ آرائیوں کے اس زمانہ میں میری طبیعت فارسی کی طرف مائل ہوئی میں نے مولانا سے اس شوق کا اظہار کیا انہوں نے فوراً بغیر کسی تأمل کے اوقات درس میں سے وقت نکال کر مجھے فارسی پڑھانا شروع کر دیا، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے چاہا، مولانا کی مستعدی اور توجہ میں کبھی ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

مولانا کا سب سے بڑا اور میری نظر میں قابل تقلید وصف یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی طلبہ کو اپنے ذاتی خیالات و معتقدات سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی صرف اپنے کام سے کام رکھا، ان کے متعدد شاگردوں کو ان کے مسلک کا علم اس وقت ہوا جب انہوں نے جامعہ میں ان کے مقالات دیکھے ورنہ وہ برسوں سے پڑھ رہے تھے اور ان کے فیض تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے تھے، کبھی انہیں شبہ نہیں گزرا کہ مولانا کے مسلک میں انفرادیت ہے اور وہ اپنا کوئی مخصوص اور جداگانہ مسلک رکھتے ہیں

مولانا جید عالم ہیں لیکن ان کے لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا، نہ جبہ اور عمامہ کے پابند ہیں نہ وعظ و تلقین کے، عام آدمیوں میں عام آدمیوں کی طرح رہتے ہیں، یہ ہے ان کی بے نفسی اور بے لوثی!

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مولانا حیدر حسن خان

عالم باعمل، صوفیِ باصفا

مولانا حیدر حسن خاں صاحب سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

ان کی دلربا شخصیت، ان کا یگانہ فضل و کمال ان کا زہد و تقویٰ ان کی سیرت سے اچھی صورت اور صورت سے بہتر سیرت، ان کی شفقت و محبت، اپنوں سے ان کی والہانہ فریفتگی، بیگانوں سے ان کا مخلصانہ برتاؤ، اس طرح کے واقعات ایک ایک کر کے دماغ کے پردہ پر یوں اجاگر ہوتے چلے گئے جیسے پردۂ سیمیں پر تصاویر متحرکہ۔

میں ۱۹۲۳ء میں ندوہ کے درجہ اوّل میں داخل ہوا، اس وقت میری عمر مشکل سے ۱۱-۱۲ سال کی ہوگی۔

پہلی مرتبہ دار الاقامہ (بورڈنگ) کی زندگی سے آشنا ہوا، عصر کے بعد اکثر لڑکے فیلڈ چلے جاتے اور ہاکی کھیلتے، کچھ امین آباد کے اور قیصر باغ کے سبزہ زاروں کی سیر کو نکل جاتے بعض گومتی کے کنارے جاتے نہاتے سیر کرتے روانیٔ آب کا منظر دیکھتے چند فیلڈ کے کنارے کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے اور اپنے دوستوں یا ساتھیوں کے کھیل پر نقد و تبصرہ کرتے، جنہیں اخبارات سے دلچسپی ہوتی وہ الاصلاح، چلے جاتے اور اخبارات و کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے لیکن میں اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر کے خوب روتا، جب تک مغرب کی اذان نہ ہو جاتی، میرا بہترین مشغلہ رونا اور گھر کو یاد کرنا تھا،

ایک روز اتفاق سے میں باہر نکلا، دفتر کے سامنے کھڑا ہوا کوئی نوٹس پڑھ رہا تھا، اتنے میں ایک صاحب اوپر سے اترے، میانہ قد، دبلا بدن، دودھ کی طرح سفید داڑھی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

سرخ وسفید چہرہ جیسے کشمیر کا سیب، سر پر ایک پگڑی، ہاتھ میں ایک چھڑی، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک، لمبا کرتا، اونچا پائجامہ میں نے بعض لڑکوں سے سنا تھا اوپر جنات رہتے ہیں، یقین ہوگیا، یہ کوئی جن ہیں، جو نوٹس میں پڑھ رہا تھا دفعۃً اس کے حروف آنکھوں کے سامنے غائب ہونے لگے، پاؤں لڑکھڑانے لگے، اور میں بیساختہ رونے لگا۔

کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہے مفتی محمد یوسف صاحب ظہر کا وضو کر رہے تھے دفعۃً ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور وہ بے ہوش ہوگئے۔ وہ نخاس میں رہتے تھے اور مولوی گنج میں یہ حادثہ پیش آیا، ندوہ میں اطلاع پہنچی سب کو افسوس ہوا، لیکن مولانا (جنہیں میں آئندہ مولوی صاحب لکھوں گا، میں انہیں اسی لفظ سے پکارا کرتا تھا) بے قرار ہوگئے، ندوہ میں اس دن تعطیل تھی، فوراً مولوی گنج گئے ایک پالکی میں انہیں لٹا کر ندوہ لائے، یہاں ان کے لیے ایک کمرے کا انتظام کیا، فوراً ڈاکٹر نعیم انصاری کو بلایا، کچھ دیر بعد میڈیکل کالج کے ایک ڈاکٹر کو بلوایا انہیں بتیس روپیہ فیس کے دیئے دو دو طالب علموں کی ایک ایک گھنٹے کے لیے ڈیوٹی لگائی، تاکہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔

ندوہ میں مفتی صاحب کے دوست شاگرد دو رفیق سب تھے مگر کسی میں وہ بیکلی وہ اضطراب، وہ بے قراری میں نے نہیں دیکھی جو مولوی صاحب میں تھی، ان کی نورانی آنکھوں سے موتی کی طرح آنسو ٹپکتے تھے۔

کئی سال گذر گئے میں درجہ ششم میں پہنچ گیا، اب میں ندوہ کا ایک خاموش طالبعلم نہیں تھا، اب میں ایسا طالب علم تھا جو باغی تھا، سرکش تھا، سٹرائیک ہو تو وہ پیش پیش ہنگامہ ہو تو وہ اس کا قائد اعظم "الاصلاح" میں جلسے ہوں تو وہ "لیڈر آف دی ہاؤس" رہنمایان قوم اور بزرگان ملت کی خدمت میں سپاسنامے پیش ہوں، ان کے اعزاز میں جلسے ہوں، انہیں پارٹیاں دی جائیں تو وہ رکن رکین اساتذہ میں بعض مجھ سے خوش تھے، بعض نالاں "انہی ناخوش" استادوں میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب بھی تھے، مولوی صاحب ان لوگوں میں تھے، جن کی رائے تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں کوئی اور کام نہ کرنا چاہیئے میں اور سب کام کرتا تھا، طلب علم ہی کا کام نہیں کرتا تھا لہذا ان کی خفگی بجا تھی۔

اس سال مولوی صاحب کا بھی ایک گھنٹہ ہمارے درجہ میں تھا، ترمذی کا درس وہی دیتے تھے، پہلے دن جب میں گیا تو وہ میری جانب مخاطب بھی نہیں ہوئے، ایک ہفتہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اسی بیگانگی کے عالم میں گذر گیا۔

مولوی صاحب کا طرز تعلیم اور اسلوب تحقیق اتنا دلکش اور نرالا تھا کہ چند ہی دنوں میں حدیث سے مجھے خاص رغبت ہو گئی، اب ان کے درس میں شریک ہوتا تو مطالعہ کر کے تیار ہو کے تھوڑے سے ہی دنوں میں وہ مجھ سے اتنے خوش ہو گئے کہ درجہ میں مجھ سے زیادہ کوئی طالب علم ان کی نظروں میں محبوب نہیں تھا، بعض طالب علموں نے صرف ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے داڑھی میں اضافہ کر لیا تھا، ہر مسئلہ میں مولوی صاحب کی ہر آواز کے ساتھ جذاً اور مرحبا کے نعرے بلند کرنا انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا میں نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی، کبھی کبھی میں مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج، استدلال اور استنباط سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا، مثلاً قرأت خلف الامام اور مسئلہ طلاق میں آخر تک مولوی صاحب کی دلیلوں سے مطمئن نہیں ہوا، لیکن ان کی شفقت و محبت کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی، انہوں نے تین طالب علموں کی ایک مجلس بنائی تھی جو گویا ان کے "ریسرچ اسٹینٹ" تھے، مصطفےٰ کریم ندوی ایم ایس سی (علیگ)، عبدالسلام قدوائی، ندوی (ادارہ تعلیمات اسلام) اور راقم الحروف ہم تینوں کو اوقات درس کے علاوہ مولوی صاحب اپنے دار الحدیث میں یاد فرماتے تھے، اور روزانہ دو ڈیڑھ گھنٹہ تک کسی خاص موضوع پر کتب حوالہ سے مواد جمع کراتے، رواۃ کے بارے میں آراء جمع کراتے صحاح ستہ سے اور دوسری کتب حدیث سے اسی موضوع پر ہم معنی حدیثیں جمع کراتے مسئلہ کی مخالفت اور موافقت میں حفاظ اصحاب اخبار اور ارباب رائے کے خیالات جمع کراتے اور پھر اپنی تحقیق انیق شروع کرتے تھے، اتنی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے بڑے سے بڑوں کے لیے اس سے اختلاف کرنا ناممکن ہو جاتا تھا، ان کا بالکل وہی طرز تھا جو "بدایۃ المجتہد" میں ابن رشد نے اختیار کیا ہے، حلقہ درس میں بھی ان کا یہی انداز تھا، ان کی ڈسک پر، شلف پر، مسند پر میز پر، سامنے کی الماری میں درجنوں کتب حوالہ موجود رہتی تھیں، جہاں کوئی مختلف فیہ مسئلہ آیا اور انہوں نے زبانی لکچر دینے کے بجائے انہی کتابوں سے مخالف اور موافق مواد طلبہ کے سامنے پیش کیا، پھر اپنی رائے، دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غیر حنفی طلباء بھی مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے مطمئن ہو جاتے تھے سوائے ہمارے ایک کٹر "اہلحدیث"، ساتھی عبدالجلیل صاحب

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فیصل کے، وہ جب بہت زچ ہو جاتے اور میں مولوی صاحب کے سامنے انہیں چھیڑتا تو برہم ہو کے فرماتے "ہم کیا جواب دیں، ہمارے عالموں سے مناظرہ کرو تو معلوم ہو،" مولوی صاحب ان کے اس جواب سے بہت محظوظ ہوتے۔

مولوی صاحب کو برنبائے دلائل حنفیت سے بڑی شیفتگی تھی مذاہب اربعہ میں وہ حنفیت کو سب سے زیادہ کتاب و سنت سے قریب سمجھتے تھے اپنی اس رائے کی تائید میں وہ بڑے ٹھوس اور وزنی دلائل بھی رکھتے تھے، امام ابوحنیفہ رضؓ سے انہیں عقیدت نہیں عشق تھا، امام صاحب کا نام آیا اور ان کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوئی، ان کا خیال تھا کہ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ پر ان کے بعد کے مصنفین کرام نے بہت زیادہ ظلم کیا ہے، امام صاحب کی مظلومیت نے ان کے دل کو رقیق بنا دیا تھا۔ ان کی حالت،

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے!

کے مصداق ہو گئی تھی۔

امام بخاری کی تاریخ صغیر میں امام ابوحنیفہ کے لیے "جعل الاسلام عروۃ" آیا ہے، ان الفاظ کا جب حوالہ دیا، یا یہ الفاظ جب انہیں یاد آجاتے تو ان کے سیل گریہ میں گرد وں کف سیلاب تھا۔

پھر مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوتا تھا، امام بخاری کو تو حفظ مراتب کے خیال سے کچھ نہ کر سکتے تھے البتہ روتے اور دوسروں کو رلانے کی کوشش کرتے امام صاحب کی مظلومیت کا ایسا دردناک نقشہ کھینچتے کہ امام عالی مقام حسین علیہ السلام کے بعد انہیں کی مظلومیت مسلم ہو جاتی، یہ موضوع جب چھڑ جاتا تو اصل سبق رہ جاتا، دوسرا گھنٹہ شروع ہو جاتا لیکن مولوی صاحب کی تقریر اسی جوش سے جاری رہتی جس جوش سے شروع ہوئی تھی، ہم اٹھنا چاہتے، وہ پکڑ پکڑ کر بٹھاتے دوسرے گھنٹہ کا کافی حصہ ختم ہو جاتا، لیکن مولوی صاحب کی تقریر ختم نہ ہوتی، آخر ہم لوگ باچشم گریاں اور باسینہ بریاں اٹھتے کم از کم مولوی صاحب ہم میں سے اکثر سعادت مندوں کے متعلق یہی سمجھتے کہ وہ ان سے زیادہ متاثر ہیں۔

اگر کسی دن ہمارا پڑھنے کو جی نہ چاہتا تو مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی اپنا ہاتھ آنکھوں تک لے جا کر میری طرف اشارہ کرتے، مطلب یہ آج محفل عزا برپا ہونی چاہیئے یا

جملہ حقوق محفوظ ہیں

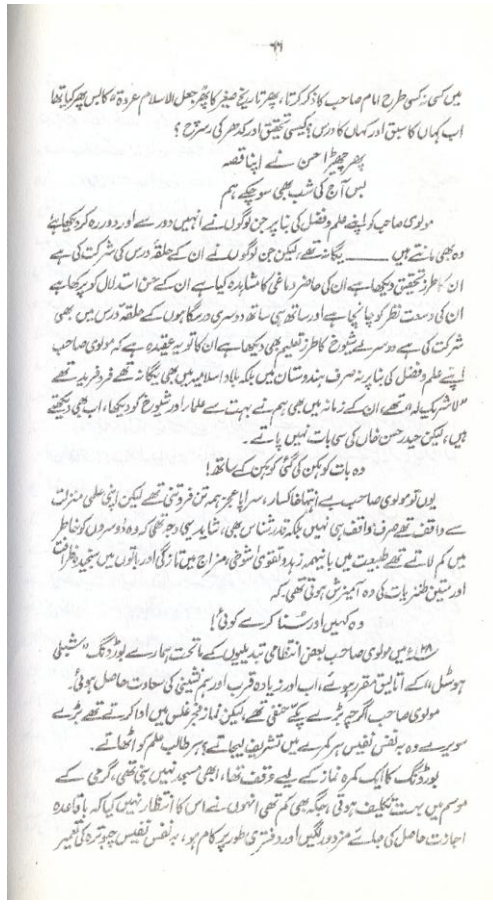

میں کسی نہ کسی طرح امام صاحب کا ذکر کرتا، پھر تاریخ صغیر کا پھر جعل الاسلام عروۃ" کا بس پھر کیا تھا اب کہاں کا سبق اور کہاں کا درس؟ کیسی تحقیق اور کدھر کی ریسرچ؟

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

مولوی صاحب کو اپنے علم و فضل کی بنا پر جن لوگوں نے انہیں دور سے اور دور رہ کر دیکھا ہے وہ بھی مانتے ہیں ـــــ یگانہ تھے، لیکن جن لوگوں نے ان کے حلقۂ درس کی شرکت کی ہے ان کا طرز تحقیق دیکھا ہے ان کی حاضر دماغی کا مشاہدہ کیا ہے ان کے حسن استدلال کو پرکھا ہے ان کی وسعت نظر کو جانچا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری درسگاہوں کے حلقۂ درس میں بھی شرکت کی ہے دوسرے شیوخ کا طرز تعلیم بھی دیکھا ہے ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ مولوی صاحب اپنے علم و فضل کی بنا پر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بلاد اسلامیہ میں بھی یگانہ تھے فرد فرید تھے "لا شریک لہ" تھے، ان کے زمانہ میں بھی ہم نے بہت سے علماء اور شیوخ کو دیکھا، اب بھی دیکھتے ہیں، لیکن حیدر حسن خاں کی سی بات نہیں پاتے۔

وہ بات کو ہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ!

یوں تو مولوی صاحب بے انتہا خاکسار، سراپا عجز ہمہ تن فروتنی تھے لیکن اپنی علمی منزلت سے واقف تھے صرف واقف ہی نہیں بلکہ قدر شناس بھی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کو خاطر میں کم لاتے تھے طبیعت میں باینہمہ زہد و تقویٰ شوخی، مزاج میں تازگی اور باتوں میں سنجیدہ ظرافت اور متین طنزیات کی وہ آمیزش ہوتی تھی۔ کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

۲۸ء میں مولوی صاحب بعض انتظامی تبدیلیوں کے ماتحت ہمارے بورڈنگ "شبلی ہوسٹل" کے اتالیق مقرر ہوئے، اب اور زیادہ قرب اور ہم نشینی کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولوی صاحب اگرچہ بڑے پکے حنفی تھے، لیکن نماز فجر غلس میں ادا کرتے تھے بڑے سویرے وہ بہ نفس نفیس ہر کمرے میں تشریف لیجاتے ہر طالب علم کو اٹھاتے۔

بورڈنگ کا ایک کمرہ نماز کے لیے وقف تھا، ابھی مسجد نہیں بنی تھی، گرمی کے موسم میں بہت تکلیف ہوتی جگہ بھی کم تھی انہوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ باقاعدہ اجازت حاصل کی جائے مزدور لگیں اور دفتری طور پر کام ہو، بہ نفس نفیس چبوترہ کی تعمیر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اپنے دست مبارک سے شروع کر دی، ہم بھی پہنچ گئے دیکھا دیکھی اور بہت سے طالبعلم بھی شامل ہو گئے، لیجئے دو ہی دن میں چبوترہ تیار ہو گیا وہاں اذان کی آواز گونجنے لگی۔ تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے تہلیل اور تسبیح کا مشغلہ شروع ہو گیا!

جب مولوی صاحب دار الاقامہ کے اتالیق بن گئے اور ہم لوگوں پر زیادہ محنت صرف کرنے لگے، اس قرب مکانی نے ان کے دل کو بھی ہم سے قریب کر دیا تھا، خارج اوقات میں وہ پہلے بھی ہمیں پڑھاتے تھے اور اب زیادہ وقت دینے لگے اتنا زیادہ کہ بعض وقت طبیعت اُکتا جاتی اور اب اپنی تہی بختی پر افسوس ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ "علم" اس وقت تک نہیں حاصل ہوتا، جب تک منطق اور فلسفہ میں درک حاصل نہ ہو۔

۱۹۳۰ء میں ایک معمولی بات پر دفعتہً "ندوہ" میں اسٹرائک ہوئی عبد السلام صاحب اس مجوزہ اسٹرائک کے سخت حامی تھے اور میں شدید مخالف "الاصلاح" کا ناظم میں تھا، شروع کے دو دنوں میں اس ہنگامہ سے میں بالکل الگ رہا۔ ایک دفعہ عبد السلام صاحب مجھ سے کنوینسنگ فرما رہے تھے، چاہتے تھے میں بھی اسٹرائک میں شریک ہو جاؤں، میں نے پوچھا اس کا مقصد کیا ہے؟ فرمایا اسٹرائک میں نے کہا "اسٹرائک کا مقصد اسٹرائک"، ارشاد ہوا "ہاں" اس جواب پر کچھ غیر ذمہ دارانہ حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں، شام کو طلبہ کا عام جلسہ ہونے والا تھا کہ اسٹرائک ہو یا نہ ہو جلسہ میں برہمی، جوش، غضب اور جنون کا طوفان امنڈ رہا تھا۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

نعرے لگ رہے ہیں۔ زندہ باد اور مردہ باد کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی الگ الگ ٹولیاں مشوروں میں مشغول ہیں۔ ہر ہر "لیڈر" محاذ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے، عوام کالانعام جان دے دینے تک پر تیار ہیں، جوش ہے کہ بڑھتا جاتا ہے ہر ہر لمحہ ایک نئے طوفان کا آئینہ دار ہر نظام برہم، ہر اصول شکستہ، ہر ضابطہ ناقابل احترام۔

دوسری طرف اساتذہ کے جلسے ہو رہے ہیں، ارکان مشورے کر رہے ہیں۔ ارباب اقتدار نظم و امن کی بحالی کے انتظامات میں مصروف ہیں، آج کی رات فیصلہ کن رات ہے، یا ادھر یا اُدھر، یا سر پہ کامیابی یا تختہ نامرادی، یہ جوش یہ ولولہ یہ ہنگامہ ہاؤ ہو یہ شور دار و گیر الامان والحفیظ۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

عشار کے بعد جلسہ ہوا، جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، چھوٹے اور بڑے سمجھ دار اور ناسمجھ، سنجیدہ اور پُرجوش، گوشۂ اعتکاف میں بیٹھنے والے اور بزم یاراں میں چہچہانے والے اساتذہ کے نیاز مند اور باغی سب ہی جمع تھے، مجمع کے ایک سرے پر تماشائی کی حیثیت سے، ایسے تماشائی کی حیثیت سے جو عنقریب خود تماشہ بننے والا تھا، میں بھی کھڑا تھا۔

عبدالسلام صاحب نے صدارت کے لیے میرا نام پیش کر دیا، یہ "رشوت" تھی، میں نے انکار کیا۔ لیکن آیئے آیئے کے شور میں میری آواز دب گئی، میں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ارباب اقتدار کو اپنی اسٹرائک سے دبالیں گے تو یہ غلط ہے، اور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ کامیابی ہو یا ناکامی ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، تو بسم اللہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، سب نے کہا ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، میں نے کہا، تو کل صبح سے اسٹرائک کیجئے اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیجئے۔

صبح ہوتے ہی اسٹرائک شروع ہو گئی، ہر ہر دروازہ پر پکیٹرس موجود تھے۔ بڑے دروازہ پر چند دوستوں کے ساتھ میں کھڑا تھا، پکٹنگ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ڈے اسکالرس بھی اندر جانے نہ پائیں، بورڈنگ کے تو سب لوگ ہمنوا تھے ہی پکٹنگ کامیاب ہوئی، اور ایک طالب علم کی بھی حاضری نہ لکھی جا سکی، سب غیر حاضر تھے، سب باغی تھے، سب نافرمان تھے ان میں بعض "گل نافرمان" بھی تھے۔

ندوہ کی تاریخ میں اتنی مکمل، ہمہ گیر اور مؤثر اسٹرائک کبھی نہیں ہوئی تھی، دو روز بعد جب اسٹرائک کرنے والے طلبہ کے نام خارج ہوئے تو حد ہو گئی، ان میں ابواللیث (مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم کے پوتے) اور صلاح الدین (مولانا عبدالودود صاحب معلم منطق و فلسفہ کے فرزند ارجمند) بھی تھے۔

جوش برابر بڑھتا جا رہا تھا، نئی نئی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں، کبھی سننے میں آتا کہ پولیس بلائی گئی ہے، کبھی مشہور ہوتا کچھ طلبہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ افواہیں آگ پر تیل کا کام کرتی تھیں۔

دوسرے روز صبح سے مطبخ بند کر دیا گیا، اس سے بھی طلبہ کے عزم و ولولہ میں کوئی

فرق نہیں آیا، آپس میں چندہ ہوا، اور بڑی پتیلیاں مٹی کے نئے بنے ہوئے چولہوں پر چڑھ گئیں، اور کھچڑی پکنے لگی، پتیلیوں میں بھی اور دماغوں میں بھی۔

تیسرے یا چوتھے روز شام کو میں مجیب (عبدالمجیب ندوی بی اے، ایل ایل، بی) کے ساتھ ڈالی گنج سیر کو گیا، ہم دونوں اکثر اسٹیشن کی طرف یا کسی اور طرف نکل جاتے تھے، مغرب کے بعد ہم واپس آئے تو دیکھا کہ صحن میں ایک جم غفیر جمع ہے اور بہت پُرجوش (لیکن بے آہنگ) آوازیں آرہی ہیں، آگے بڑھے تو معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی "گھیرے میں" لے لیے گئے ہیں، بیچ میں وہ کھڑے ہیں،

ہر کجا بود چشمۂ شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

کا سماں آنکھوں کے سامنے "مردم و مرغ و مور" پر اباندھے کھڑے ہیں، عمامہ کی سفیدی دیکھتے ہی سمجھ گیا، سید صاحب ہیں، آگے بڑھا، عرفان خاں (حافظ محمد عرفان خاں ندوی بی اے جامعہ تحصیلدار بھوپال) اپنے چھوٹے سے لیکن (دیدہ زیب) قد کے ساتھ ایک ایک بالشت اچھل کر بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہے ہیں، میں نے انہیں خاموش کیا اور سید صاحب سے گفتگو شروع کر دی، معلوم ہوا مراد آباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا جلسہ ہے اور وہ وہیں تشریف لے جا رہے ہیں، میں نے زیر لب عرض کیا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا مے روی

انہیں جلدی تھی اور وہ چاہتے تھے اپنے سامنے ابھی معاملہ طے کر کے جائیں۔ وہ جس شفقت، ملاطفت، مرحمت اور عطوفت کے ساتھ پیش آرہے تھے مجمع اس سنس SENSE میں اس کا خیر مقدم نہیں کر رہا تھا، سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی میں اس پر کھڑا ہوا، اور تقریر شروع کر دی اور سید صاحب کی مداخلت کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، اصل میں سید صاحب جس طرح اس گتھی کو سلجھا رہے تھے وہ بہترین چارہ کار تھا، لیکن مشتعل مجمع صلح سے ہمیشہ بیزار رہتا ہے، میری تقریر کے بعد بھی بہت سے لوگ مطمئن نہیں ہوتے، البتہ عام طور پر ایک پُرامید فضا پیدا

ہوگئی افسوس ہے کہ بعد میں سید صاحب کی مداخلت کارگر نہیں ہوئی اور معاملہ پھر وہیں کا وہیں رہ گیا، اس مشتعل مجمع کے فرد ہمارے عمران خاں (حافظ محمد عمران خاں ندوی) فاضل ازہر مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء بھی تھے، یہ حضرت زبان سے تو کچھ نہیں گویا ہوئے البتہ پورے عزم و ثبات کے ساتھ اپنے لیڈروں کی کمزوری پر پہلے تو خوب آنسو بہائے اور پھر بھوک ہڑتال شروع کردی ساری رات فاقہ سے گزر گئی۔ دوسرے روز کا بڑا حصہ اسی طرح گزر گیا، مگر اس شیر مرد نے ایک دانہ جو بھی نہ استعمال کیا۔ حالانکہ اقبال کا قول ہے۔ کہ

ہمیشہ نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

عرفان پہلے خوشامد کرکے اور بعد میں پٹ کے اور سگ باش برادر خورد مباش کا عملی تجربہ کرکے خاموش ہوگئے، دوستوں نے سمجھایا ناکام رہے ساتھیوں نے التجائیں کیں، لیکن وہ نگاہ غضب سے (ٹھوکر سے نہیں) ٹھکرا دی گئیں، اب میں پہنچا میں نے منالیا۔

لائے اس بت کو التجا کرکے
کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

یہ اتنی لمبی داستان بیان ہوگئی، مگر اس میں مولوی صاحب کا ذکر جمیل نہ آیا؟ وہ بھی سن لیجئے، مولوی صاحب توقع کے مطابق اسٹرائک کرنے والوں کے سخت مخالف تھے، بے حد نالاں اور برہم تھے، پٹھان تھے اور غصہ ور بھی، ہر وقت اپنی جیب میں ایک بالشت کا چاقو رکھتے تھے کہ کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا، اور اس کا دیدۂ گستاخ باہر نکالا۔

اس سارے عرصہ میں مولوی صاحب سے نہیں ملا، عمداً نہیں ملا، کس آنکھ سے ملتا؟ کس دل سے ملتا؟ کس زبان سے ملتا؟

راہ میں وہ ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

وہ ہوسٹل کے نگراں اور اتالیق تھے، لیکن میرا کمال دیکھئے میں نے ان کا آمنا سامنا ہونے ہی نہیں دیا۔

اسٹرائک کے ختم کرنے کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی، تعطیل کردی جائے چنانچہ دو مہینے کی تعطیل کردی گئی، سب لوگ منتشر ہوگئے، میں مجیب اور عبد السلام تین آدمی رہ گئے کہ لکھنو میں رہ کر کام کو جاری رکھیں گے۔

طلبہ کے رخصت ہونے کا منظر بھی دل ہلا دینے والا منظر تھا، کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوں نجم الدین کی وداعی نظم نے تو سماں باندھ دیا تھا۔

اب تک میں مولوی صاحب کی عزت ایک شفیق استاد ایک وسیع النظر عالم ایک علامہ دوراں ایک شیخ الحدیث ایک متقی اور پرہیزگار صوفی کی حیثیت سے کرتا تھا، لیکن اب وہ وقت آرہا ہے کہ مولوی صاحب ایک انسان ایک کامل العیار انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، ان کی ساری حیثیتیں مدہم پڑجاتی ہیں، یہ حیثیت سب پر بالا ہوتی ہے وہ مافوق الانسان نہیں تھے صرف انسان ہی کے متعلق غالب نے کہا ہے:۔

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

انسان کامل وہی ہے جس میں کوئی خلا نہ ہو، اگر ہو بھی تو وہ خود بخود پُر ہو جاتا ہے، ہمارے مولوی صاحب ایسے ہی انسان تھے خدا ان کی تربت عنبریں کرے!

تعطیل کلاں ختم ہوئی، دار العلوم کے نئے میقات کا آغاز ہُوا، ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسٹرائک ہوئی ہی نہیں تھی۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

لوگ آتے تھے، معافی نامہ پر دستخط کرتے تھے اور داخل ہو جاتے تھے، ان میں بعض مجبور تھے، بعض بد نفس، پانچ آدمی ممنوع الادخال تھے، عبد السلام، مصطفےٰ کریم، نجم الدین، عبد الحی اور میں۔

چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما؟

نجم الدین اور عبد الحی اپنے اپنے گھر پر تھے، میں اور عبد السلام لکھنؤ میں تھے، ہم نے ارادہ کیا کہ جامعہ جائیں، اتفاق سے مولانا عبد الودود صاحب سے ملاقات ہوئی، مولانا بڑے لطف و عنایت سے پیش آئے، انہوں نے اصرار کیا "تم بھی داخلہ کرالو"، میں نے کہا "معافی جو مانگنی پڑے گی"، فرمایا "تم مجھ سے ہاں کہہ دو، باقی سب کچھ میں کرلوں گا، تم نہ معافی مانگنا نہ معذرت نامہ لکھنا، میں خاموش ہوگیا، انہوں نے کوشش شروع کردی، لیکن ناکام رہے، اور خاموش ہوگئے۔

عبد السلام صاحب کی مولوی صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی، میں اب تک ان سے نہیں ملا تھا عبد السلام صاحب کا بیان تھا مولوی صاحب اس طرح ملے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، میری اور

ان کی قسمت پر افسوس کرتے رہے، اب انہوں نے کمر ہمت باندھی، سید صاحب لکھنؤ ہی میں تھے ان سے ملے، وہ بیچارے تو راضی تھے لیکن اساتذہ ارکان اور ناظم صاحب کا عندیہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ناظم صاحب خلاف تھے اساتذہ حامی تھے، متعدد ارکان کے پاس مولوی صاحب بہ نفس نفیس کنوینسنگ کی غرض سے تشریف لے گئے، مولوی عبدالباری صاحب ندوی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کے "غریب خانہ" واقع ڈالی گنج بھی اس حالت میں پاپیادہ تشریف لے گئے کہ بخار چڑھا ہوا تھا، گرمی کا موسم تھا اور سورج پوری مدت کے ساتھ چمک رہا تھا، مولوی صاحب کی یہ کوشش جاری تھی کہ میں خیرآباد چلا آیا، عبدالسلام صاحب لکھنؤ ہی میں رہے، پھر وہ بھی وطن چلے گئے، چند روز بعد مولوی صاحب کا خط پہنچا، سب کچھ طے ہو گیا، رئیس کو بھی اطلاع کر دو، اور تم دونوں فوراً ندوہ پہنچ جاؤ، عبدالسلام صاحب نے خود مجھے خط لکھا، میں حالات ایسے دیکھ آیا تھا کہ مجھے یقین نہیں تھا مولوی صاحب کو کامیابی ہوگی، میں نے جواب دیا جب تک دفتر سے باقاعدہ اطلاع نہ آ جائے، جانے میں جلدی نہ کرو، لیکن انہوں نے مولوی صاحب کا خط پاتے ہی بوریہ بستر باندھا اور لکھنؤ پہنچ گئے، مولوی صاحب فوراً مہتمم صاحب کے پاس گئے اطلاع دی عبدالسلام آ گئے ہیں، رئیس آنے والے ہیں، مگر مہتمم صاحب کے پاس نظامت سے نیا حکم آ گیا تھا کہ ان مجرموں کو داخل نہ کیا جائے مہتمم صاحب نے یہ خبر مولوی صاحب کو سنائی وہ سناٹے میں آ گئے، کتنے خوش ہو کر گئے تھے اور کتنے ملول و غمگین واپس آئے۔

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، عبدالسلام سے کیا کہیں؟ اسی روز شام کو عبدالسلام صاحب خیرآباد پہنچے اور تمام واقعات کی اطلاع دی، اب جامعہ جانے کی رائے اور زیادہ پختہ ہو گئی جو کچھ ہوا تکلیف دہ ضرور تھا، لیکن خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔

چند روز بعد میں لکھنؤ پہنچا، ندوہ ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا، اب اتنے عرصہ کے بعد ــــ مولوی صاحب سے ملا۔

ہمیں ندوہ چھوڑنے کا کافی غم تھا، یہ وہ سرزمین تھی جہاں ہم نے عقل کی آنکھیں کھولیں۔ بصارت اور بصیرت حاصل کی، پڑھا اور بہت کچھ سیکھا، یہاں کا

چپہ چپہ کونہ کونہ گوشہ گوشہ ہمارے لیے مرکز جذب و کشش تھا، ہماری انجمن آرائیوں کا راز داں تھا، ہماری محفل طرازیوں کا غماز تھا، جب ہم ندوہ سے جامعہ روانہ ہو رہے تھے تو بے ساختہ یہ شعر میری زبان پر آ گیا۔

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو
ٹکڑے تو ڈھونڈھ لیں دل صد پاش پاش کے

اب وہ احباب کہاں؟ وہ بے تکلفی کی مجلس کہاں؟ وہ قہقہے اور چہچہے کہاں وہ بے فکری اور نشاط خاطر کہاں؟ اب ایک نئی دنیا میں جا رہے تھے، نئے ماحول سے سابقہ پڑ رہا تھا نئے لوگوں سے دوچار ہو رہے تھے وہاں ہر چیز نئی بنانا ہوگی، دوستی بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گی تعلقات بھی از سر نو قائم ہونگے، رسم و راہ کا سلسلہ بھی نیا ہوگا، یہاں ہر چیز پہلے سے کئی سال کے رہن سہن سے بنی ہوئی چلی آ رہی تھی ـــــ بہر حال ان غم آگین خیالات سے ہم کافی متاثر تھے، لیکن مولوی صاحب کی حالت ہی کچھ اور تھی، وہ رو رہے تھے سچ مچ رو رہے تھے ان کی حور جنت کی طرح پاک آنکھ آنسو بہا رہی تھی انہیں عبد السلام اور رئیس کی جدائی شاق تھی حالانکہ یہ دونوں ان کی خاک پا بھی نہ تھے، گرد راہ تو بڑی چیز ہے۔ وہ تو کچھ دور تک شرف ہمرکابی حاصل کرتی ہے۔

عبد السلام مجھ سے دو روز پہلے دہلی چلے گئے تھے۔ تیسرے روز جب میں روانہ ہوا تو اسٹیشن پر بہت سے دوست الوداع کہنے آئے تھے ان میں ایک بزرگ دوست بھی تھے، یہ ہمارے مولوی صاحب تھے وہ اپنے عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں سے محبت کرنے والوں اور تعلق رکھنے والوں سے یہی برتاؤ کرتے تھے۔

ہم لوگ جامعہ میں داخل ہو گئے ـــــ جامعہ کا عہد بہار بھی ایک مفصل داستان کا طالب ہے ـــــ گرمیوں کی تعطیل قریب آئی دفعتاً دل میں خیال پیدا ہوا، ندوہ میں بھی تعطیل ہونے والی ہے، کیوں نہ اس مشترک تعطیل سے فائدہ اٹھایا جائے، فوراً مولوی صاحب کو خط لکھا، توقع سے پیشتر جواب آیا وہ تیار تھے اس پر تیار تھے کہ اپنی دو مہینے کی تعطیل غارت کر دیں گے، اس پیرانہ سالی میں وطن نہیں جائیں گے، اس جھلسا دینے والی لو اور تڑپا دینے والی گرمی میں لکھنؤ میں رہیں گے تکلیفیں برداشت کریں گے، مصیبتیں سہینگے، بے آرامی اٹھائیں گے لیکن اپنے دو محبوب شاگردوں کا دل میلا نہیں کریں گے ان کا دامن آرزو گوہر مراد

سے بھر دینگے انہیں اپنے درسے خالی نہیں پھیرینگے۔

لکھنؤ پہنچے، ندوہ گئے، بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرہ میں ڈیرہ ڈالا، سارا بورڈنگ خالی تھا، طلبہ جا چکے تھے، اساتذہ رخصت ہو چکے تھے، شاگرد پیشہ بھی چھٹی منا رہے تھے صرف چند دور دراز کے طالبعلم تھے اور ایک چپراسی، سب سے بڑی دقت کھانے کی تھی، مطبخ بند تھا، ہمیں اپنی فکر نہیں مولوی صاحب کی تھی، ہم تو ہر طرح گزر کر سکتے تھے لیکن مولوی صاحب، بس سوال یہ تھا، عبدالسلام صاحب کو غرہ تھا کہ وہ "دال روٹی" پکا لیتے ہیں، اسی بھروسہ پر دال اور آٹا لایا گیا، مولوی صاحب کو بھی ہم نے اپنے ساتھ شریک کر لیا، ارہر کی دال پکی، ویسی ہی جیسی اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی ایک "بچگانہ" نظم میں تصویر کھینچی ہے۔

دال ارہر کی بے مزہ پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

اب روٹی کی باری آئی، کوئی مثلث نما، کوئی مربع لیکن مدور کوئی نہیں، یہاں تک بھی غنیمت تھا، سخت اتنی جیسے چمڑا، ایک کونہ میرے ہاتھ میں تھا دوسرا مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہم دونوں زور لگا رہے ہیں لیکن وہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی، عبدالسلام صاحب کی اس "مہارت" پہ مجھے غصہ آرہا تھا، مولوی صاحب ہنس رہے تھے۔ اور یہ حضرت خود مسکرا رہے تھے۔

دوسرے دن باقاعدہ بخاری کا درس شروع ہو گیا، اوقاتِ درس ملاحظہ ہوں:۔
نماز فجر کے بعد سے ۱۲ بجے دوپہر تک یعنی جب تک کھانا نہ آجائے، پھر نماز ظہر کے بعد سے عصر کے وقت تک، پھر مغرب کے بعد سے عشا تک چھٹی جمعہ کو بھی نہیں، بغیر اس پروگرام کے اتنے مختصر عرصہ میں ہم بخاری کیونکر ختم کر سکتے تھے؟

مولوی صاحب کے سامنے عبارت پڑھنا یعنی قرأت کرنا آسان نہ تھا وہ آخری حرف کے اعراب پر خاص زور دیتے تھے کہ صاف پڑھا جائے، خواہ وہ اسم ہو علم ہو فعل ہو، کچھ ہو، مثلاً ان کے سامنے "عن عکرمہ" یا "عن ابی ہریرہ" ہرگز نہیں پڑھ سکتے تھے ضروری تھا کہ آخری حرف کا اعراب نمایاں کیا جائے یعنی "عن عکرمہ" یا "عن ابی ہریرہ" پڑھا جائے، پہلے روز عبدالسلام صاحب نے قرأت کی، دو ایک جگہ اسماء اعلام کے آخری

حرف کو ساکن پڑھا، مولوی صاحب نے ٹوکا تو گڑبڑا گئے اور گھبرا کر کچھ غلطیاں کر بیٹھے، مولوی صاحب برابر ٹوکتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ درس کی رفتار سست رہی، دوسرے دن بھی یہی ہوا، تیسرے دن بھی عبدالسلام صاحب کچھ سوچتے جاتے تھے (یہ پرانی عادت ہے) اور پڑھتے جاتے تھے اور کچھوے کی طرح خراماں چل رہے تھے، مولوی صاحب نے مجھ سے کہا "میاں تم پڑھو"، میں نے ٹالنا چاہا معذرت کی جس میں انکسار سے زیادہ خود شناسی کو دخل تھا، لیکن انہوں نے پھر اصرار فرمایا "میاں تم ہی پڑھو" میں نے

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفاں فوج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

کہہ کے قرأت شروع کر دی، آدھا صفحہ پڑھ گیا، مولوی صاحب نے کہیں نہیں ٹوکا، اب میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے فراٹے بھرنا شروع کئے کہ عبدالسلام صاحب منہ دیکھتے رہ گئے، اب تو مولوی صاحب پر میرا سکہ جم گیا، حاضر و غائب ستائش ہو رہی ہے، میاں! (میاں تکیہ کلام تھا) رئیس تو ایسی عبارت پڑھتا ہے، اتنا شوقین ہے کہ کیا کہوں؟ اب مستقل طور پر قرأت میرے ذمہ ہو گئی، جب تک درس کا سلسلہ جاری رہا قرأت میں ہی کرتا رہا، درس اتنی تیز رفتاری کے ساتھ جاری تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک دن میں ایک ایک پارہ بخاری کا ہم نے ختم کر لیا، یونہی رواروی میں نہیں اسی شان تحقیق و تدقیق سے، اسی غور و فکر سے، اسی ہر ہر حوالے اور ہر ہر بحث پر سیر حاصل مذاکرہ کے ساتھ جو مولوی صاحب کے حلقۂ درس کی ممتاز، نمایاں اور شاید واحد خصوصیت تھی ایک دن جمعہ کے بعد پڑھنے کو جی نہ چاہا، مولوی صاحب کو اطلاع دیئے بغیر ہم دونوں ڈالی گنج چلے گئے۔ وہاں سے مرمرے، شکر اور برف لیتے آئے کہ ستو بنائیں گے ہم اپنے کام میں مشغول تھے کہ مولوی صاحب اپنا سرخ رومال لپیٹے ہوئے اس چلچلاتی دھوپ میں آتے دکھائی دیئے، وہ ہماری "خیریت" معلوم کرنے تشریف لا رہے تھے، ان سے ہم نے کہہ دیا "آج جمعہ" ہے، امین آباد بھی جانا ہے اب کل پڑھیں گے، مولوی صاحب "اچھا میاں" کہہ کر واپس چلے گئے۔

مولوی صاحب ایک عزیز شاگرد کے ایک ضروری کام سے چند روز کیلئے دارالمصنفین

جملہ حقوق محفوظ ہیں

گئے، اب ہم بیکار تھے، ندوہ کا کتب خانہ کھلا ہوا تھا، اپنے استاد مولوی کلیم احمد صاحب ندوی سے ہیں "فسانہ آزاد" کی چار جلدیں لایا اور ختم کر دیں، ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد مولوی صاحب واپس آ گئے، نہ آرام لیا نہ ستائے آتے ہی انہماک اور شغف کے ساتھ تدریس میں مشغول ہو گئے، ایک روز حلقۂ درس پورے زور کے ساتھ جاری تھا، قدم قدم پر مولوی صاحب داد تحقیق دے رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامنے کی کتاب کا صفحہ الٹا ایک پرزہ کاغذ نظر آیا، جس پر مولوی صاحب کے "نومرحوم" بھتیجے یا بھانجے کے ہاتھ کی یادداشت لکھی ہوئی تھی، مولوی صاحب ان مرحوم کو بہت چاہتے تھے، ان کے ہاتھ کے نقوش جو نظر آئے، تو مولوی صاحب کی آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر پھر گئی، سلسلۂ درس منقطع کر کے اسی پرزہ پر نظر جمادی، کئی بار "ہا! میاں!" فرمایا، میں نے پوچھا "کیا بات ہے مولوی صاحب؟" انہوں نے مرحوم کے فضائل و حسنات، ان کے اوصاف و کمالات اور ان کی جواں مرگی کا حال ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا کہ ہم دونوں خلصے متاثر ہوئے۔

اب آگے بڑا نازک مرحلہ آتا ہے، مولوی صاحب نے مرحوم کا سراپا بیان کرنا شروع کیا اور خاص زور ان کی رکھالی داڑھی" پر دیا، مولوی صاحب جب جوش بیان میں ہوتے تھے تو ک کا لفظ کھ فرماتے تھے مثلاً کالا کو کھالا، کہتے تھے، جب کھالی داڑھی نے طول کھینچا اور مکررات کی صورت اختیار کر لی تو قطعاً بلا ارادہ اور بالکل بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی، اور میں زور سے ہنس پڑا، مولوی صاحب بڑے نازک دماغ بھی تھے، کیا مجال جو کوئی خلاف شان حرکت برداشت کر لیں انہوں نے دفعتہً پوچھا، کیا ہوا میاں؟ کیوں ہنسے؟ میرے لیے یہ کٹھن گھڑی تھی، مولوی صاحب کو اگر یقین ہو جاتا کہ ان کے بیانِ غم پر مجھے ہنسی آئی ہے تو شاگرد میں ہمیشہ کے لیے ان کی بارگاہ میں مردود ہو جاتا، لیکن

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

دفعتہً مولوی صاحب کے کوئی ملنے والے آ گئے، وہ ان کی طرف مخاطب ہو گئے، جب یہ صاحب چلے گئے تو میں نے غم والم کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے پھر مرحوم کا ذکر چھیڑا، اور ہمہ تن متوجہ ہو کر مولوی صاحب کا بیان سنتا رہا۔

ندوہ میں ہمارے ابتدائی دور کے ایک ساتھی وصی احمد صاحب (جواب طبیہ کالج دہلی میں پڑھتے تھے) لکھنؤ آئے اور سیدھے ہمارے پاس آ گئے اپنے علیل بھائی کو لے

کر آئے تھے جن کا آپریشن ہونے والا تھا، آپریشن ناکام ہوا دوسرے روز ان کا انتقال ہو گیا، ظاہر ہے ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا، انتظامات میں مدد دینا وصی احمد صاحب کے لیے جملہ امکانی آسانیاں بہم پہنچانا ہمارا فرض تھا، وہ ہمارے ندوی بھائی تھے، ان کے بھائی گویا ہمارے بھائی تھے، حامد صاحب نے کفن وغیرہ کے انتظامات میں وصی احمد صاحب کی مدد کی، جب ہم لوگ تجہیز و تکفین و تدفین کے ارادے سے جانے لگے تو مولوی صاحب سے اجازت لی، حالانکہ وصی احمد صاحب مولوی صاحب کے شاگرد نہیں تھے، لیکن محض انسانی ہمدردی سے وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے، میں نے کہا، مولوی صاحب اس گرمی میں آپ کہاں زحمت کریں گے، یہاں سے عیش باغ تک پاپیادہ جانا اور آنا ہے، کوئی ۸-۹ میل کا چکر ہوگا، لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ سنی، فرمایا "واہ میاں مجھے کیا سمجھتے ہو کیا میں اتنا بوڑھا ہوں کہ ایک مسلمان کی میت کو کاندھا بھی نہ دوں؟ وہ کسی طرح نہ مانے اور ہم سب کے ساتھ عیش باغ تک جہاں قبرستان تھا گئے، برابر میّت کو کاندھا دیتے رہے، واپسی پر وہ آسانی سے یکہ پر واپس آسکتے تھے، لیکن چونکہ آٹھ دس آدمی ساتھ تھے اور یہ سب پیدل جا رہے تھے، مولوی صاحب کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ تنہا یکہ پر بیٹھ کر الگ الگ روانہ ہو جائیں، میرے اصرار پر فرمایا "میاں، سب کے ساتھ آئے ہیں ساتھ جائیں گے، ساتھ کیوں چھوڑیں؟ آخر انہوں نے اپنا کما کیا اور عیش باغ سے پھر پاپیادہ واپس آئے، واپسی پر ہم لوگ تھک کر چُور ہو گئے تھے لیکن وہ ویسے ہی ہشاش بشاش تھے، گویا ماندگی تھی ہی نہیں۔

تعطیل کے ختم ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ بخاری کی تکمیل ہو گئی مولوی صاحب بہت خوش ہوئے، طالب علمی کے زمانہ میں ہم میں سے کسی نے بھی اس توجہ اور انہماک شغف اور شوق کا اظہار نہیں کیا تھا، ان کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی، بخاری ختم ہم نے کی تھی، لیکن باچھیں ان کی کھلی جا رہی تھیں، بند قبا ان کے ٹوٹے جا رہے تھے، اس خوشنودی کی سند میں مولوی صاحب نے ہمیں وہ انعام دیا جو زیادہ سے زیادہ تھا، توقع اور امید، اہلیت اور استحقاق سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ تھا!

مولوی صاحب نے ہمیں دو سندیں مرحمت فرمائیں ایک سند تو بلفظہ وہ تھی جو ان کے استاد جلیل حضرت شیخ محمد صاحب یمنی نے انہیں مرحمت فرمائی تھی، بس فرق یہ تھا کہ اپنے

نام نامی کے بجائے میری سند میں میرا اور عبدالسلام صاحب کی سند میں ان کا نام ڈال دیا تھا دوسری سند ندوہ کے فارم پر مہتمم دارالعلوم کی حیثیت سے ہمیں مرحمت فرمائی، اب شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کی غیبت کے باعث مولوی صاحب کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوگیا، یعنی اب وہ شیخ الحدیث بھی تھے اور دارالعلوم کے مہتمم بھی، ان دونوں ذمہ داریوں کو اپنے معیار کے مطابق انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔

جس سال میں دہلی (جامعہ) گیا ہوں، اسی سال میں شدید ملیریا میں مبتلا ہوا، علاج کی طرف توجہ نہ کی، مرض بڑھتا گیا اور بگڑتا گیا، کئی مہینے کے بعد زندگی سے مایوس ہوکر میں وطن کے قصد سے روانہ ہوا، ندوہ پہنچا اور محب اللہ صاحب (ندوی، ایم اے، علیگ) کے ہاں مقیم ہوا، ان کا اصرار تھا کہ لکھنؤ میں علاج کراؤں، مولوی صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنے مریض کو دیکھنے تشریف لائے، بڑی دیر تک تشریف فرما رہے، اور اصرار فرماتے رہے، کہ میں لکھنؤ میں علاج کراؤں، مجھے یقین تھا، میں بچوں گا نہیں، اسی لئے میں وطن جانا چاہتا تھا کہ وہیں آسودہ خاک ہوں، میں نے کسی کی نہ سنی اور وطن چلا گیا۔

میں ہی نہیں میرے دوست خود مولوی صاحب میری زندگی سے مایوس تھے، عبدالسلام میرے بعد لکھنؤ آتے انہوں نے مجیب اللہ صاحب کو ورغلایا وہ بیچارے ڈاکٹر عبدالعلی کے پاس گئے انہیں خیرآباد جانے کی زحمت اٹھانے پر آمادہ کیا۔ پھر ٹیکسی کا انتظام کیا اور ڈاکٹر صاحب کو لے کر خیرآباد پہنچ گئے۔

مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوا، وہ بھی خیرآباد تشریف لائے، شام کی گاڑی سے مجیب وغیرہ بھی پہنچ گئے، ڈاکٹر صاحب کی معجز نما دوا نے حیرت انگیز فائدہ کیا، ایک ہفتہ میں بالکل تندرست ہوگیا، لکھنؤ آیا، عمران خاں نے دو قسم کا گوشت اور کئی قسم کی مٹھائیاں دسترخوان پر جمع کی تھیں، میں نے اس طرح کھایا جیسے بیمار ہی نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کی حذاقت کا میں ہمیشہ سے قائل تھا، اب ان کی مسیحا نفسی کا بھی قائل ہوگیا۔

ندوہ کی انجمن طلباء قدیم عرصہ ہوا مرحوم و مغفور ہو چکی تھی، ہم اب ندوہ کے طالب علم نہیں تھے لیکن "قدیم طالب علم" تو تھے، ہمارے اس حق سے کون انکار کر سکتا تھا، جامعہ میں رہ کر ہم نے انجمن طلباء قدیم کو زندہ کیا، صرف زندہ ہی نہیں کیا اس میں حرکت اور عمل کی لہر پیدا کر دی، دو تین بڑے شاندار سالانہ جلسے ہوئے، ایسے شاندار جو ندوہ کی تاریخ میں یادگار رہیں

گئے، پہلا جلسہ شاید ۱۹۳۲ء میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا تھا دُور دُور سے لوگ شرکت کیلئے آئے تھے، مجلس استقبالیہ کی طرف سے مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام تھا میں بھی مہمانوں کے کیمپ میں مقیم ہوا، اور بھی کئی دوست ساتھ تھے، مولوی صاحب تشریف لائے، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شکایت کی کہ تم یہاں کیوں ٹھہرے؟ تمہیں تو میرے ساتھ ٹھہرنا چاہیے تھا، اچھا اب چلو اور وہیں رہو، مولوی صاحب اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جو اپنا ہو وہ کہیں اور ٹھہرے کہیں اور کھائے، کسی اور کا مہمان ہو، صرف عمران خاں کے بارے میں مولوی صاحب نے مجھے مستثنیٰ کر رکھا تھا، میرے ان کے تعلقات سے وہ واقف تھے، اس لیے اس معاملہ میں دخل نہیں دیتے تھے، البتہ کہیں اور ٹھہر جاؤں تو مولوی صاحب اسے برداشت نہیں کرتے تھے جب مولوی صاحب دعوت کرتے، گوشت خود لاتے، اپنی خاص نگرانی میں اور کبھی کبھی اپنے دست مبارک سے پکاتے تھے، جانتے تھے مجھے گوشت کا بہت شوق ہے زیادہ سے زیادہ بوٹیاں مجھے مرحمت فرماتے آخر وقت تک ان کا اصرار جاری رہتا تھا، میاں کھاؤ، ابھی کھایا ہی کیا ہے اور کھاؤ، لو یہ بوٹی۔

میرے اور عبدالسلام صاحب کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ عجیب و غریب قسم کے رہے ہیں مولوی صاحب، ہم دونوں سے اتنے ہل مل گئے تھے، کہ کوئی تکلف نہیں رہ گیا تھا، اگرچہ حفظ مراتب میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو "عبدالسلام" نہیں "عبد رئیس" کہتے تھے، بات یہ تھی کہ یہ حضرت اپنی زبان کبھی بند نہیں کرتے تھے موقع بے موقع بحث پر ہمیشہ تیار رہتے تھے، اور کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ جاتے تھے، جو بعض اوقات طوفان خیز بن جاتی تھی، اس سلسلے میں مجھ سے اکثر ناروا حرکتیں ان کی "اصلاح و تربیت" کے لیے سرزد ہوتی رہتی تھیں جو "ضرب خفیف" سے شروع ہو کر نہ معلوم کہاں کہاں تک پہنچتی تھیں، مولوی صاحب کو میرے ان کے یہ تعلقات اتنے بھاتے تھے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "میاں اپنے عبد کو ڈانٹو" میں ڈانٹتا تو مولوی صاحب بڑی دیر تک لطف لیتے رہتے، کبھی فرماتے "میاں" تمہارے عبد نے یہ کیا! گویا مولوی صاحب نے ان کی شکایت کی اور اب چاہتے تھے کہ ان کے سامنے میں اپنے "عبد" کی اصلاح و تربیت کروں، جب میں ارشاد کی تعمیل کرتا کن الفاظ میں کہوں مولوی صاحب پر اہتزاز اور انبساط کی کیسی کیفیت طاری ہوتی تھی، وہ قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے

تھے لیکن اس موقع پر ان کے دہن مبارک سے قہقہہ کی ہلکی سی آواز نکلنے لگی تھی، کبھی ہیں نہ ہوتا اور مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو چھیڑنا چاہتے تو فرماتے اچھا رئیس کو آنے دو، اس سے کہوں گا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ اگرچہ سو روپے سے نہیں بڑھی، لیکن وہ اتنے فراخدل تھے کہ یہ ساری آمدنی ان کی مہمانداریوں، دوست نوازیوں، غریب طلبہ کی اعانت اور مفت خوروں کی دلجوئیوں پر صرف ہو جاتی تھی، پنجاب یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور بعض دوسری جگہوں کے ممتحن بھی تھے، اس طرح سال بھر میں انہیں چار پانچ سو روپے مل جاتے تھے، لیکن یہ رقم بھی کم ایسا ہوتا تھا کہ ان کی ذات پر خرچ ہوتی ہو، وہ کسی درجہ میں بھی روپیہ کو عزیز نہیں رکھتے تھے، روپیہ ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا، وہ حقیقتاً اسے ہاتھ کا میل سمجھتے تھے، آیا اور گیا۔

جو لوگ ان کی اس افتادِ طبیعت سے واقف تھے وہ ان کی اس عادت سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے، "قرض" لے لیا، اب نہ مقروض صاحب دیتے ہیں نہ مولوی صاحب مانگتے ہیں بات آئی گئی ہو گئی، میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے قرض لے لے کر مولوی صاحب کو سخت دشواریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا، ان کی زبان مبارک شکوہ سے آلودہ نہ ہوئی، انہوں نے تقاضا بھی نہیں کیا، نادہند مقروض کی صورت دیکھ کر وہ خود شرما جاتے تھے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

طبیعت بالکل بچوں کی سی پائی تھی، وہی سادگی، وہی بھولا پن، وہی معصومیت وہی بے فکری جو بچوں کی خصوصیت ہوتی ہے مولوی صاحب کی بھی تھی، کھانا جیسا مل گیا کھا لیا، کپڑا جیسا میسر آیا پہن لیا، چارپائی ہوئی تو اس پر آرام فرمایا، فرش ہوا تو اس پر استراحت فرما گئے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کسی کام سے ڈاکٹر صاحب کے پاس امین آباد تشریف لے جا رہے تھے میں اور عبدالسلام صاحب ساتھ تھے شاید دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا ہم دونوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے پھر بھی سردی سے ٹھٹھرے جا رہے تھے مولوی صاحب اس شان سے بالاخانہ سے برآمد ہوئے کہ پاؤں میں نرمی کا سرخ جوتا (کاش وہ مل جائے اور اس کی خاک آنکھوں کی زینت بن سکے) جسم مبارک پر وہی گاڑھے کے کپڑے، سر پر پگڑی،

کاندھے پر سرخ رومال، روئی کا ایک شلوکہ بھی پہنے ہوئے تھے، لیکن اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ اس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے، میں نے کہا، مولوی صاحب بٹن لگا لیجئے، فرمایا میاں بٹن لگاتے ہوئے میں گھبراتا ہوں، میں نے عرض کیا "سردی بہت ہے"، ارشاد ہوا میاں سردی نوجوانوں کو بہت لگتی ہے، اصل میں وہ اپنی آن کے خلاف سمجھتے تھے کہ شلوکہ کے بٹن لگائیں، جب انہوں نے جوانی میں یہ نہیں کیا تو اب بڑھاپے میں کیوں کریں؟ آگے بڑھے موتی محل کے پل پر پہنچے، اب تو مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں کھڑا ہو گیا مولوی صاحب بھی کھڑے ہو گئے، میں نے بے کچھ کہے سنے شلوکہ کے سب بٹن لگا دیئے وہ مسکراتے رہے اور میری اس گستاخی پر ذرا بھی برہم نہ ہوئے۔

مولوی صاحب، جس طرح اپنے ظاہری فضل و کمال سے بے پروا اور بے خبر تھے اسی طرح اپنے باطنی عروج و ارتقاء کا احساس بھی نہیں فرماتے تھے، وہ جس طرح متبحر عالم تھے، اسی طرح ایک برگزیدہ صوفی بھی تھے، لیکن جس طرح ان کے علم و فضل پر فاکساری کا پردہ پڑا ہوا تھا، اسی طرح ان کا روحانی عروج و ارتقاء بھی پردۂ خفا میں مستور رہتا تھا۔

ہمہ وقت مولوی صاحب باوضو رہتے تھے، جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو، جاڑے میں ان بے چارے کو گرم پانی کہاں سے ملتا، لیکن وہ ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے، بے وضو رہنا کسی حالت میں بھی انہیں گوارا نہ تھا۔

ان کے زہد و عبادت کے معمولات بھی ایسے تھے کہ چشم ظاہر بیں کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ عابد اور زاہد ہیں، تہجد کی نماز بالالتزام پڑھتے، پھر فجر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، نماز فجر قلس میں پڑھتے، پھر چہرہ اور سر پر رومال ڈال کر اپنے معمولات ادا کرتے، یہاں تک کہ اشراق کا وقت آجاتا، پھر اس سے فارغ ہوتے۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب حضرت شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت تھے، صرف بیعت نہیں مجاز بھی، وہ خود اسے اس طرح چھپاتے تھے جیسے کوئی بڑا راز ہے اور اس راز کا افشا کوئی بڑی معصیت!

حق بات کہنے میں، علم کا وقار قائم رکھنے میں وہ مرعوب ہونا، بڑی سے بڑی شخصیت سے متاثر ہونا، دار العلوم کے حکام والا مقام اور ارکان والا شان سے مداہنت کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے، اگر کوئی علم کی توہین کرتا تھا، علماء کا وقار مجروح کرتا تھا، اپنی

جہالت کے زعم میں خود اپنے تئیں علامۂ دوران سمجھنے لگتا تھا، اقتدار کی ترنگ میں اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا تھا، پھر مولوی صاحب قابو میں نہیں رہتے تھے، وہ سامنے بھی بہت کچھ کہتے تھے، اور جب پس پشت موقع آجاتا بحث چھڑ جاتی تھی، تو بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، ان کے طنزیات لطیف مستقل سامان وجد و کیف ہوتے تھے۔

"اپنے"، طالب علموں کا وہ دوسروں سے بھی اتنا ہی احترام کراتے تھے جتنا خود ان کا کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی لکھنو تشریف لائے، اور حسب معمول منشی احتشام علی صاحب کے دولت کدہ واقع خیال گنج میں اقامت پذیر ہوئے۔

مولوی صاحب امراء و رؤسا سے ملنے میں بہت ہچکچاتے تھے، وہ اسے علم و فن کے خلاف شان سمجھتے تھے، کہ علماء امراء کے دربار میں جائیں، ان کے دولت کدوں کا طواف کریں، ان کی ڈیوڑھیوں پر بار بار پہنچیں، لیکن شیروانی صاحب اس اصول سے مستثنیٰ تھے مولوی صاحب اس کے قائل تھے کہ وہ "عالم" ہیں، وہ بھی مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے، مولوی صاحب کے جی میں آیا کہ منشی صاحب کے یہاں جا کر ان سے ملیں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے "صلاح" پوچھی، ہم نے تائید کی تیار ہو گئے، اپنے ساتھ مجھے اور عبدالسلام کو بھی لیتے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا، کوٹھی کے صحن میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں دھوپ میں منشی صاحب اور شیروانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، دوسری کرسیوں پر کچھ اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے، صرف ایک کرسی خالی تھی، شیروانی صاحب بڑے تپاک سے ملے، اٹھ کر مصافحہ کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا "تشریف رکھیئے"، مگر مولوی صاحب کہاں بیٹھنے والے تھے؟ "میاں جب تک ہمارے ساتھی (ہم دونوں) نہ بیٹھیں، ہم کیسے بیٹھ جائیں؟ خود بھی کھڑے رہے اور اپنے ساتھ حاضرین کو بھی کھڑا رکھا، جب تک اور کرسیاں نہ آگئیں، اور ہم لوگ نہ بیٹھ گئے وہ کسی طرح نہ بیٹھے، ان کی یہی شان تھی، وہ اپنے شاگردوں کو حقیر اور کم مایہ نہیں سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو ٹونک کا ویرانہ پسند تھا، اپنے اس وطن کو وہ ہندوستان کے تمام مقامات سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے، وہاں کی ندی کا پانی ان کے نزدیک اتنا ہاضم تھا کہ جب اس کے فضائل بیان کرتے تو سفوف جالینوس اور نمک سلیمانی بھی اس کے

سامنے ہیچ معلوم ہوتے۔

ٹونک کے در و دیوار سے بھی انہیں محبت تھی، وہاں کے عہد گزشتہ کی کہانیاں بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے، وہاں کی عدالت میں داڑھی منڈوں کی گواہی قاضی نہیں قبول کرتا، اس پر مولوی صاحب کو بڑا فخر تھا وہ اپنے وطن کی اس "اسلامیت" پر نازاں تھے ہم لوگ گوش ہوش سے ان کی یہ پیاری پیاری باتیں سنا کرتے۔ اسی دوران میں وہ دعوت بھی دیتے کہ میاں ایک دفعہ ٹونک ضرور آؤ، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ تمنا پوری نہ ہوئی، البتہ جامعہ کے زمانہ طالب علمی میں اتفاقاً یہ آرزو بر آئی۔

میں جامعہ میں جب داخل ہوا تو پاس ہی طبیہ کالج میں میرے ابتدائی دور کے ایک ندوہ کے ساتھی نصیر الدین صاحب (مولانا معین الدین صاحب اجمیری سابق صدر جمعیۃ العلماء ہند اور غازی محی الدین صاحب اجمیری سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی کے بھتیجے اور شفاء الملک حکیم نظام الدین صاحب کے فرزند سعادت مند) بھی پڑھتے تھے ہم دونوں کے ندوہ میں بہت گہرے مراسم تھے اب کئی برسوں کے بعد دہلی میں ملاقات ہوگئی، تو عہد ماضی اور زیادہ جوش اور سرگرمی سے تازہ ہوگیا، ان کا فاضل وقت میرے پاس "محمد علی ہوسٹل" میں صرف ہوتا تھا، میرے فرصت کے اوقات ان کے بورڈنگ ہاؤس میں گزرتے تھے، ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ اجمیر گیا، اور وہاں جاکر میں نے ٹونک چلنے کا تقاضہ کیا، چنانچہ دوسرے روز ہم لوگ ٹونک روانہ ہوگئے، شام کو پہنچے، نصیر صاحب اپنے تعلقات کے سبب حکیم برکات احمد صاحب مرحوم کے ہاں ٹھہرے، اور مجھے بھی زبردستی (ان کی اس طرح کی زبردستیوں کا میں ہمیشہ تختہ مشق بنتا رہا ہوں) وہیں ٹھہرایا۔

ٹونک پہنچ کر نصیر صاحب نے کہا "صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے عید اگر اجمیر میں نہ ہوئی تو والد صاحب بہت خفا ہوں گے، اور اب اتنا ہی وقت ہے کہ آج کی رات رہو اور صبح ہوتے ہی چل دو" یہ الفاظ کچھ ایسے خوف و دہشت کے لہجہ میں انہوں نے کہا کہ میں بھی راضی ہوگیا۔ حالانکہ تکلیف بہت ہوئی، سوچا یہ تھا کہ ٹونک میں دو تین دن رہیں گے، لیکن ایک دن بھی رہنے کا موقعہ نہ ملا۔ افطار کے بعد ہم دونوں مولوی صاحب کے علم کدہ پر پہنچے، گھر کے پاس ہی مسجد تھی، مولوی صاحب کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمود حسن خاں صاحب (صاحب معجم المصنفین) وہاں معتکف تھے، مولوی صاحب بھی انہی کے پاس تشریف رکھتے تھے

اچانک ملاقات ہوئی، بہت خوش ہوئے، کچھ کچھ گئے، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں دوسری جگہ ٹھہرا ہوں تو بہت برہم ہوئے، بار بار شکوہ فرماتے تھے "میاں آئے بھی تو بس اتنی دیر کے لیے!" میں نے کھانا وہیں کھایا، مولوی صاحب کا بس چلتا تو سارے گھر کو بھوکا رکھتے اور جو کچھ تھا (ماشاءاللہ بہت کچھ تھا) سب مجھے نوش جاں کرا دیتے۔

انہیں بڑی تمنا تھی کہ مجھے ٹونک کی سیر کراتے، وہاں کا قلعہ وہاں کی جامع مسجد وہاں ان کا بنایا ہوا مدرسہ فرقانیہ یہ سب مجھے دکھاتے، لیکن اب رات ہو چکی تھی اور صبح یہ مسافرت ختم ہونے والی تھی، اب کیا ہو؟ مولوی صاحب سب سے زیادہ اسی بات پر ملول تھے۔

لیکن مولوی صاحب آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے اسی وقت انہوں نے لالٹین سنبھالی اور تیار ہو گئے "چلو میاں"، ان کی اس جواں ہمتی پر میں عش عش کر گیا! ابھی افطار و طعام سے فارغ ہوتے ہیں ذرا دیر بھی آرام کا موقعہ نہیں ملا، اور اب کئی میل پیدل چلنے پر تیار ہیں، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں، ہم دونوں چلے، پہلے تو مولوی صاحب نے وہاں کا بازار دکھایا پھر دور سے وہاں کا قلعہ دکھایا جو اندھیرے اور کہر کے سبب مجھے نظر نہ آیا، لیکن اس خیال سے کہ مولوی صاحب مزید تکلیف نہ کریں، میں نے اس کی خوش منظری کی پورے شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ تعریف کر دی، مولوی صاحب آگے چلے اب جامع مسجد پہنچے اس کا ایک ایک در دکھا رہے ہیں، اس کی مضبوطی، پختگی اور خوبصورتی اور خوشنمائی کے گن گا رہے ہیں۔ لالٹین اٹھا اٹھا کر اس کے ہر مینارہ کی مینا کاری اور صنعت پر خاص توجہ دلا رہے ہیں، یہاں سے نکلے تو اب انہوں نے اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ فرقانیہ دکھایا۔ جس میں قرآن شریف، قرأت، اور ابتدائی عربی کی تعلیم ہوتی تھی، یہ مدرسہ مولوی صاحب نے قائم کیا تھا، اس پر بڑی محنت کی تھی، اس کی ترقی پر ان کی توجہ ہمیشہ مرکوز رہتی تھی، خدا کے فضل سے اس وقت تک کامیابی سے چل رہا ہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہم اس راؤنڈ سے فارغ ہوئے، میں نے چاہا کہ مولوی صاحب اپنے مکان تشریف لے جائیں، لیکن میں مہمان تو انہیں کا تھا، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ "مہمان" کو تنہا چھوڑ دیں؟ وہ میری قیام گاہ تک تشریف لائے، بڑی دیر تک جلوہ فرما رہے، زیادہ تر علی اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر رات گئے تشریف لے گئے۔

صبح اٹھتے ہی ہم لوگ ٹونک سے پور روانہ ہو گئے، وہاں کچھ دیر قیام کر کے اجمیر چلے گئے۔

عید کا چاند ریل میں دیکھا اور عین نماز کے وقت اجمیر پہنچے۔

مولوی صاحب عام علماء کرام کے برعکس عربی بے تکلفی سے بولتے تھے لکھتے بھی روانی سے تھے، فارسی پر بھی اچھا خاصا عبور تھا، لیکن اردو کا شاید بالکل مطالعہ نہیں کیا تھا، پچھلے زمانہ کے لوگ اردو کو کم مایہ اور حقیر زبان سمجھتے تھے اس لیے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے تھے، مولوی صاحب بھی پرانے زمانے کے آدمی تھے، اور اردو زبان کی افادیت اور اہمیت سے قطعاً معترف نہیں تھے، پھر بھی کوئی اچھی کتاب مل جاتی تھی، تو اسے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کی تعریف میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے لیے سب سے زیادہ دقت آزما کام اردو میں کچھ لکھنا ہوتا تھا، اب وہ اتالیق تھے، ہر روز لکھنے سے انہیں کام رہنے لگا، ہر درخواست انہی کے توسط سے جاتی اور اس پر انہیں رائے لکھنی پڑتی، اردو رسم الخط میں مولوی صاحب یا ئے معروف و مجہول کا فرق نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے "بخار" کی وجہ سے ایک روز کی درخواست دی، وہ طالب علم کا دل بھی رکھنا چاہتے تھے اور جھوٹ بولنا بھی انہیں منظور نہ تھا اس لیے کہ درخواست دہندہ کو بخار نہیں تھا، مولوی صاحب نے اس درخواست پر تحریر فرمایا، "یہ کہتی ہیں کہ انہیں بخار ہے، لہٰذا ایک روز کی رخصت دی جائے"، اس پر مجھے بہت ہنسی آئی بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ ان کا رسم الخط یہی ہے۔

قرآن شریف مولوی صاحب خاص لحن سے پڑھتے تھے، اتنا مؤثر دلنشین اور موہ لینے والا لحن جس کی تعریف نہیں ہو سکتی، عربی میں وہ خطبہ دیتے تھے، وہ بھی اسی طرز کا ہوتا تھا، انہوں نے جب سے جمعہ کی نماز پڑھانا شروع کی، بیرونی نمازیوں (لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ) کی تعداد میں غیر معمولی اور نمایاں اضافہ ہو گیا تھا،

ان کی وضع ایسی ہوتی تھی کہ دیکھنے والے پر رعب بھی پڑتا اور اثر بھی، ان کی سادگی پر ہزاروں بناوٹیں قربان، پاؤں میں نری کا سُرخ جوتا، دبلا بدن میانہ قد، بڑی بڑی مخمور آنکھیں، ریش مبارک سفید، سر پر ایک پگڑی اونچا پائجامہ، نیچا کرتہ، چلتے اس طرح سے تھے جیسے ڈھلوان جگہ سے کوئی اتر رہا ہو، رفتار خاصی تیز۔

آواز گرچہ دار نہیں تھی لیکن پُروقار تھی، انداز میں خاکساری نمایاں جس سے ملتے جھک کر ملتے، ترفع نمود اور نمائش کے جذبے سے کوسوں دور، وہ دل کھول کر ملتے تھے، چاہتے

تھے دوسرے بھی ایسے ہی ملیں، کاٹ پیچ کے آدمیوں سے دور رہتے تھے، بعض دفعہ ایسے لوگوں کے منہ پران کی کمزوری ظاہر کر دیتے تھے۔

ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ان کی طبیعت ایک سادہ ورق تھی ان کا مزاج ان کے عادات واطوار، ان کے شمائل وخصائل سب میں اسلامیت للّٰہیت اور شائستگی کا جلوہ نمودار رہتا تھا۔

وہ خفا ہوتے تھے تو اپنی خفگی کو چھپاتے نہیں تھے، جتنے خفا ہوتے تھے اس سے زیادہ کا اظہار کرتے تھے پھر جب خوش ہوتے تھے تو اس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، ہمارے دو ساتھیوں سے وہ اسٹرائک کے زمانے میں بہت خفا تھے، اس خفگی کا علی الاعلان اظہار بھی فرماتے تھے، ایک مرتبہ یہی ذکر چھڑا انکی خفگی کا آفتاب نصف النہار پر تھا معلوم ہوتا تھا اس کی تمازت اور حدّت سے معتوبین جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے میں نے خوشامد کی نہیں مانے، التجا کی شرف قبول سے محروم رہی، سفارش کی رد کر دی گئی، پھر ان کا سراپا نور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور ان دونوں کو معاف کر دینے کی استدعا کی مولوی صاحب ذرا ٹھنڈے ہوئے، میری خوشامد کا سلسلہ جاری رہا، تھوڑی دیر کے بعد ان کا آئینہ کی طرح صاف شفاف دل گرد وغبار سے پاک ہو گیا، سب کچھ بھول گئے، سب کچھ معاف کر دیا۔ یا تو وفور غضب سے چہرہ تمتمایا ہوا تھا یا جوش مرحمت میں پھول کی طرح کھل گیا۔

ان دونوں معتوبین میں سے ایک صاحب بعد میں ندوہ کے دفتر میں ملازم ہو گئے، مولوی صاحب ان سے اب اس طرح پیش آتے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، ان کی خفگی افسانہ پارینہ بن چکی تھی، انہوں نے اپنی سعادت مندی، خدمت گزاری اور طاعت کیشی سے مولوی صاحب کا دل موہ لیا، پھر تو وہ ان سے اتنے خوش ہوئے کہ قریب قریب انہیں اپنا معتمد علیہ بنا لیا۔

وہ داڑھی پر، نماز کی پابندی پر، وضع اسلامی پر زور دیتے تھے، لیکن ان کی خوشی اور خفگی کا معیار جداگانہ تھا، اس کا ان چیزوں سے تعلق نہیں تھا۔ وہ صورت نہیں دل دیکھتے تھے ان کی نگاہیں دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں دل کے معائنہ کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے اس میں تبدیلی کم ہوتی تھی، ان کے کئی ایسے شاگرد تھے جن کی داڑھی یک مشت دو انگشت کے حدود سے تجاوز کر چکی تھی اسلامی وضع بھی رکھتے تھے، نماز کے بھی پابند تھے، ان کی

خدمت گزاری میں بھی سرگرم رہتے تھے، ان کی ہر بات کی تائید بھی کرتے تھے وہ اگر دن کو رات فرمادیں تو وہ لوگ

"اینک ماہ پروین"

کا نعرہ لگانے لگیں، لیکن ان سے مولوی صاحب ذرا بھی خوش نہیں تھے بعض اوقات تو بُری طرح جھڑک دیتے تھے، کبھی ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے، کبھی ان کی باتوں سے اثر نہیں لیتے تھے، کبھی اپنا شریک حلقہ نہیں بناتے تھے برعکس ازیں بعض ایسے طلباء تھے جو اس سختی سے شرائط بالا پورے نہیں کرتے تھے، انہیں مولوی صاحب تنبیہ کرتے رہتے تھے، سمجھاتے رہتے تھے ان کی اصلاح میں برابر سرگرم رہا کرتے تھے لیکن دل کے معائنہ کے بعد انہیں "اپنا لیتے" تھے، انہیں زیادہ سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی ہر بات مانتے تھے، ان کا خیال رکھتے تھے، اثر قبول کرتے تھے۔

دل کے پہچاننے کا کمال مولوی صاحب میں ایسا تھا کہ طبقۂ علماء میں بالخصوص یہ چیز بہت کم ملے گی، یہ حضرات زیادہ تر ظواہر کو دیکھتے ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر غلط رائے قائم کرتے ہیں، مولوی صاحب کی نظر بطون پر رہتی تھی، اس لیے ان کی رائے بہت کم غلط ہوتی تھی، اور انہیں اپنے فیصلہ میں شاذ و نادر تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں ندوہ کی مسجد کا افتتاح تھا، اس میں شرکت کے لیے میں دہلی سے آیا تھا، اسی زمانہ میں سید مرتضیٰ بہادر کی زیر صدارت لکھنؤ میں خلافت کانفرنس ہو رہی تھی، وہیں خلافت کی ادارت کے معاملے طے ہوئے اور جنوری ۱۹۲۴ء کے آغاز میں میں بمبئی روانہ ہو گیا،

میں بمبئی روانہ ہوا چلتے وقت مولوی صاحب نے نصیحت فرمائی میاں علم کی مزاولت جاری رکھنا، اس جملہ کو بار بار فرمایا، کچھ سوچتے اور یہی فرماتے۔

بعض اہم مسائل پر مولوی صاحب نے عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے املا کرائے تھے، ان کی تمنا تھی یہ عام ہوں پھیلیں اور اشاعت پائیں تاکہ لوگ مستفید ہوں، ان میں ایک رسالہ ایسا تھا جو ان کی تحقیق و تدقیق محنت و مطالعہ وقت خیال، اور وسعت نظر، کاوش و جستجو کا شاہکار کہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے مندرجات کم علم اور کم سواد لوگوں کے لیے گمراہی کے موجب بھی ہو سکتے تھے مولوی صاحب اس کی اشاعت کے خاص طور پر شائق

تھے، میں نے کہا مولوی صاحب اس رسالہ کی عام اشاعت اُردو تو اُردو، عربی زبان میں بھی مناسب نہیں ہے، فرمایا "کیوں میاں" میں نے عرض کیا "آپ کا یہ رسالہ مضنون بہ غیر اہلہ" ہے، بہت ہنسے، بڑی دیر تک لطف لیتے رہے بار بار اس لفظ کو فرماتے دہراتے اور تبسم فرماتے،

مسئلہ حجاب اور طلاق پر بھی انہوں نے بڑی دماغ کاوی اور دیدہ ریزی سے الگ الگ رسالے لکھے تھے ان میں سے پہلا رسالہ میں ۱۹۳۷ء میں اپنے ساتھ بمبئی لے آیا، بمبئی میں بہتر سے بہتر عربی ٹائپ موجود تھا اور لکھنو میں بدتر سے بدتر ٹائپ ملنے میں بھی دشواریاں تھیں، میں اگر لیتھو میں چھاپنا چاہتا تو بڑی آسانی سے خلافت پریس میں چھاپ سکتا تھا، لیکن میں چاہتا تھا اس رسالہ کی اشاعت بلاد اسلامیہ میں بھی ہو، اور وہاں کے لوگ ٹائپ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ لیتھو کے عربی مطبوعات میں خواہ وہ کتنے ہی پُر مغز اور اہم ہوں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔

بدقسمتی سے بعض ایسے موانع پیش آئے کہ وہ دو برس تک نہ شائع ہو سکا آخر ۱۹۳۵ء میں میری کوشش اور ان کے ایک عزیز شاگرد مولوی خلیل شرف الدین صاحب المکتبی کی مہربانی سے وہ شائع ہوا، مولوی صاحب اسے مطبوعہ صورت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، وہ چاہتے تھے، ان کی علمی تحقیق عام ہو جائے، لوگ جمود، قدامت اور "وجدنا علیہ آبائنا" کی گمراہی سے نکلیں، اپنے دماغ سے سوچیں اپنی آنکھ سے دیکھیں، اپنے دل سے پرکھیں، جو پہلو مضبوط پائیں اسے اختیار کر لیں اور اسی پر عمل پیرا ہوں، وہ اپنے نور بصیرت کے متعلق خدا سے اقبال کے الفاظ کہا کرتے تھے ؎

مرے قافلہ میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

مولوی صاحب کا استخارہ بڑے غضب کا ہوتا تھا، کبھی غلط پڑا ہی نہیں جب کوئی مصیبت ہو پریشانی ہو تکلیف ہو اپنے لیے یا اپنے مخصوص عزیزوں اور شاگردوں کے لیے وہ استخارہ کرتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ نماز عشا کے بعد ایک مخصوص دعا پڑھتے تھے، اس میں اس بات کا ذکر بھی کرتے تھے جس کے لیے استخارہ کر رہے ہوتے تھے، پھر سو جاتے تھے، رات کو خواب میں اس امر کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ معلوم ہو جاتا تھا، جو

کچھ معلوم ہوتا تھا میرے علم میں وہ ہمیشہ صحیح ہوتا تھا، دو ایک واقعات میرے سامنے گزرے اور وہ بالکل مولوی صاحب کے استخارہ کے مطابق صحیح اور درست ثابت ہوئے۔

مولوی صاحب کشف و کرامت کے جذب و سلوک کے مدعی نہ تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان کی طریقت شریعت سے جدا نہ تھی۔

ہندوستان کے نامور بزرگ شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مسترشد تھے اور مجاز بھی تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان سب خصوصیتوں کو وہ چشم مردم سے پنہاں رکھتے تھے ان کا اظہار و اعلان بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

ہم دونوں پر (مجھ پر اور عبدالسلام صاحب پر) ان کی خاص نوازش تھی، علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی بھی ہمیں گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، ہماری روحانی اصلاح و تربیت ان کی بہترین آرزو تھی، ان کی مرضی تھی کہ ہم ان سے بیعت ہو جائیں، ایک روز ندوہ کی مسجد میں ہم دونوں نماز فجر کے بعد ان کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے۔

خوشا روزے و فرخ روزگارے

یہ کتنی بڑی سعادت تھی لیکن کتنے بڑے بدبختوں کے حصے میں آئی جو ہرگز اس کے اہل نہ تھے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی میں راقم الحروف کا نکاح ہوا، میری تمنا تھی مولوی صاحب بھی اس میں شریک ہوں صرف شریک ہی نہ ہوں، وہی نکاح بھی پڑھائیں، وہ چپ چپاتے دہلی روانہ ہو گئے۔ اتفاق اسی گاڑی سے میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری بھی شرکت کے لیے تشریف لا رہے تھے، انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ مولوی صاحب دہلی اسی مقصد کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں، انہوں نے پوچھا آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا جہاں تم جا رہے ہو میاں بھائی صاحب نے لاکھ لاکھ مختلف ترکیبوں سے پوچھا لیکن انہوں نے نہ بتانا تھا نہ بتایا، دہلی کے اسٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا، اب بھائی سمجھے کہ مولوی صاحب کیوں تشریف لائے ہیں۔

دہلی سے روانہ ہونے لگے تو خیر و برکت کی بہت سی دعائیں دیں، اس خلوص و اپنائیت سے جس کی مولوی صاحب کے پاس کمی نہ تھی، لیکن اب ان کے بعد یہ جنس نایاب ہے، ناپید ہے، عنقا ہے۔

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں ؟

میں اسٹیشن تک پہنچانے گیا، ان کا بستر کیا اصرار کیا کہ وہ استراحت فرمائیں، ان کا مزاج بھی کچھ ناساز تھا فوراً لیٹ گئے، گاڑی روانہ ہوئی اور میں نہ معلوم کیا سوچتا ہوا واپس آگیا۔

آخری ملاقات ۴۰ء میں ہوئی تھی، اس کے کچھ دنوں بعد مولوی صاحب بعض حالات سے دل برداشتہ ہوکر کچھ وطن کی کشش سے مجبور ہوکر ٹونک چلے گئے۔

وہ اپنی خودداری پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دیتے تھے، ٹونک جاکے مالی اعتبار سے وہ بہت تکلیف میں رہے لیکن انہیں یہ اطمینان تھا کہ اب "نوکر" نہیں ہیں، اب ضعیفی بھی غالب آچکی تھی، عمر تقریباً ۷۵ سال کی ہوگی، تقریباً دو سال تک اپنے وطن میں علم و فن کے فیوض سے لوگوں کو مستفید کرتے رہے پھر وقت آگیا، وہ وقت جو آکر کبھی نہیں ٹلتا، جو نہ جوان کے ساتھ رعایت کرتا ہے، نہ بوڑھے کے ساتھ، وہ موت سے خائف نہیں تھے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسم بر لب اوست

ان کا وقت جب آیا تو وہ پوری تیاری کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے اور رفیق اعلےٰ سے جا ملے۔

مبارک ہے وہ سرزمین جس کے سینہ پر حیدر حسن خاں کا جسم نورانی ہمیشگی کی نیند کے لیے رکھا گیا۔

وہ حیدر حسن جو علم کی زینت تھا، جسکے دم سے قال الرسول کی محفلیں آباد تھیں جس کا وجود قال اللہ کہنے والوں کے لیے شمع ہدایت تھا جو "قال اقول" اور قیل و قال کرنے والوں سے روگرداں رہتا تھا، جس کا جسم پھول کے مانند سبک جس کی روح نور سے زیادہ لطیف، آہ اب ایسے لوگ کہاں ہیں جن پر انسانیت فخر کرے اخلاق کو جن پر ناز ہو؟ کردار جن کے وجود سے روشن اور تاباں ہوں؟ ہونگے کچھ لوگ ضرور ہوں گے، لیکن حیدر حسن کے سے نہ ہونگے، ہماری نظر میں تو وہی ایک پیر مرد دانا تھا، جس کے ساتھ یہ سب خصوصیتیں رخصت ہوگئیں۔ اس ایک ہستی کے اٹھ جانے سے علم و فضل تحقیق و تدقیق، انسانیت اور للّٰہیت شرافت اور کرامت وقار اور ایثار، زہد و انکسار کی دنیا سونی ہوگئی۔

دوست ہوں یا عزیز، اُستاد ہوں یا بزرگ، ساتھی ہوں یا رفیق ہم ہر ایک کے سامنے ایک جداگانہ رنگ میں نظر آتے ہیں، دوست کے سامنے بے تکلف ہو جاتے ہیں اپنی کہتے ہیں اس کی سنتے ہیں، عزیز پر کوئی مصیبت ہو ہمارا خون جوش میں آجاتا ہے اور ہم سراپا عمل ہو کر اس کے مداوا میں مصروف ہو جاتے ہیں، استاد کی خدمت کرنا، احترام کرنا، اطاعت سے پیش آنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، بزرگ کے سامنے ہم معصومیت کی تصویر بن جاتے ہیں ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سنتے ہیں اس کی زندگی سے سبق، اس کے کارناموں سے ہمت، اس کی عظمت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، ساتھی ہمارے کام آتا ہے، وہ ہمیں سکھ پہنچاتا ہے ہم اس کے آرام کا خیال کرتے ہیں، وہ کچھ ہم سے چاہتا ہے ہم کچھ اس سے تقاضہ رکھتے ہیں، رفیق سے ہمارا ناطہ بس کام تک ہوتا ہے، کوئی ایک بات ہے جسمیں وہ ہمارا ہم اس کے رفیق پھر اس کی منزل اور ہمارا راستہ جدا، یہی وجہ ہے کہ ہم دوست کے سامنے جو کچھ ہوتے ہیں عزیز کے سامنے نہیں ہوتے، استاد کے سامنے ہمارا جو رنگ ہوتا ہے بزرگ کے سامنے نہیں ہوتا، ساتھی ہمارا جو روپ دیکھتا ہے، رفیق اس کا درشن نہیں کر پاتا، یہ ہماری انفرادی حیثیتیں ہیں جو اسی وقت اُجاگر ہوتی ہیں۔ جب ان کا محل ہو، موقع ہو،

مولوی صاحب ہمارے دوست بھی تھے اور عزیز بھی، استاد بھی اور بزرگ بھی، ساتھی بھی اور رفیق بھی، ہر رنگ میں ہم نے انہیں دیکھا پرکھا جانچا اور کھرا پایا، وہ دوست کی حیثیت سے ہمارے رازدار عزیز کی حیثیت سے ہمارے جان نثار استاد کی حیثیت سے رہبر بزرگ کی حیثیت سے اخلاق و نصیحت کے پیام بر، ساتھی کی حیثیت سے دکھ اور درد کے ساتھی، رفیق کی حیثیت سے تن من دھن سے ہر کام میں شریک، ہمارے لیے تعین مشکل ہے کہ وہ ہمارے کیا تھے، ہم ان کے کیا تھے، ہم ان کی خاک پا بھی نہیں تھے لیکن وہ ہمارے سب کچھ تھے، بہت کچھ تھے اور ایسے کچھ تھے جس کا بیان لفظ و عبارت کی مدد سے ناممکن ہے۔

ہم نے انہیں دور سے بھی دیکھا اور نزدیک سے بھی غصہ میں بھی اور عالم مرحمت میں بھی تلخ اور کھری نکتہ چینی کرتے بھی اور تعریف و توصیف کے دریا بہاتے ہوئے بھی، دُکھ میں بھی اور خوشحالی میں بھی، تنہائی میں بھی اور مجمع میں بھی، دوستوں میں اور حکام والا مقام کے دربار میں بھی ارکان لاشان کے قصور و محلات میں

بھی ہمعصروں میں بھی تنگ نظروں میں بھی قدر شناسان علم کے سامنے بھی نمائندگان جہل و جہل مرکب کے حضور میں بھی، ہر رنگ میں ہر مقام پر، ہر حیثیت سے وہ صرف حیدر حسن خاں تھے اور کچھ نہیں تھے!

ہمارا ان کا دس برس تک ساتھ رہا، یہ مدت خاصی طویل ہے۔ اتنے عرصہ میں ہم نے دیکھا ہے، پرانی دوستیاں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں گہرے تعلقات داستان پارینہ بن گئے، خلوص اور یگانگت کے دعوے نقش باطل ثابت ہوئے جو پہلے اچھے تھے اب برے بہت برے بن گئے۔ جو پہلے بُرے تھے اب اچھے بہت اچھے نظر آنے لگے۔ اتنے طویل عرصہ میں انسان کی رائے اس کے تجربے اس کے مشاہدے اس کے فیصلے کتنے کچھ منقلب نہیں ہوتے؟ دوسروں پر بھی یہی گذرتی ہے۔ ہم پر بھی یہ گزر چکی ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اتنے مکمل مشاہدے اور مفصل تر تجارب کی روشنی میں بھی حیدر حسن خاں کا وجود سمندر کا وہ "مینارۂ نور" بنا رہا۔ جس سے زندگی کے جہاز اور ہستی کے سفینے صراط مستقیم حاصل کرتے ہیں۔ ہلاکت کی چٹانیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

پہلے سمجھے تھے ہم نے مولوی صاحب کو خوب جی بھر کے دیکھ لیا اور اب کہ وہ ہم میں موجود نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ایک برق جمنڈہ تھی جو چمکی اور غائب ہو گئی

جھانک کر اس نے جو چلمن ڈال دی
دیکھنے والوں نے گردن ڈال دی

شعر عامیانہ ہو تو ہو، لیکن حسب حال ضرور ہے۔

بے شک یہ خاکی دنیا حیدر حسن خاں کے وجود سے محروم ہو گئی، لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اس مرد مومن کا استقبال دوسری دنیا میں کس شان سے ہو رہا ہے اس دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آکر وہ رسول کا شارح اور مفسر پیام برادر داعی اس دنیا میں پہنچ چکا ہے جہاں نوکری کی پابندیاں ہیں نہ دوسروں کے اشارۂ چشم و ابرو کا کچھ مفہوم ہے، نہ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم وہاں صرف رحمت ہے، ربوبیت ہے، شان مغفرت ہے، جس کے جلو میں یہ نعائم موجود ہوں وہ رونے والوں کا دیدۂ تر کیوں دیکھے؟

جا! اے بیقرار روح یثرب کے سرکار کے دربار میں جا! تیری خدمات مقبول ہوئیں، اسی دربار میں ہمیشگی کی زندگی بسر کر۔ الوداع۔ الوداع!

مولانا حسین احمد

ماضی کی چند بھولی بسری باتیں

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس کے ساتھ ساتھ مجلس خلافت کا بھی سالانہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ ندوہ کے چند طلبہ شرکت کے لیے گئے تھے ان میں میں بھی تھا۔ جلسہ کے صدر مولانا محمد علی مرحوم تھے، اس جلسہ میں وقت کے اہم ترین مسئلہ یعنی نہرو رپورٹ پر بحث و گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ متعدد لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور تقریباً سب ہی نے رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قرار دیا۔

اب ایک اور مقرر صاحب اسٹیج پر تشریف لائے یہ مولانا حسین احمد تھے آپ نے ایک طویل تقریر کی، مولانا کو ہندوستان سے متعلق ہندو اور انگریز مورخوں کے اقوال زبانی یاد ہیں اور اپنی تقریر میں بڑی روانی کے ساتھ وہ انہیں پیش کیا کرتے ہیں اس تقریر کی خصوصیت بھی یہی تھی، تاریخ سے یعنی ماضی سے گزر کر مولانا جب حال پر آتے تو اور زیادہ فصاحت سے انہوں نے اپنے خیالات ظاہر کئے، تقریر میں انگریزوں کے خلاف بھی بہت کچھ کہا تھا، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے انگریزوں سے زیادہ ہندوؤں کے خلاف، ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی کے خلاف نہایت تلخ اور تند باتیں کہی تھیں، مولانا کی تقریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کو "پاکستان" بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

چنانچہ تاریخی حوالوں سے ہندوؤں کے وطن کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے فرمایا کہ وہ تو وہاں بھی جا سکتے ہیں اور اس دیس کی سرزمین پر کوئی حق نہیں رکھتے، لیکن ہم نے تو اس ملک کو فتح کیا ہے اور اس طرح فتح کیا ہے کہ ہم اس سرزمین پر مرنے کے بعد بھی قبضہ رکھتے ہیں، ہر روز نہ جانے کتنے مسلمان مرتے رہتے ہیں اور ہر مسلمان مرنے کے بعد اس سرزمین کے ایک حصہ پر قابض ہو جاتا ہے، لہٰذا ہم تو کسی طرح بھی یہا

سے نہیں جا سکتے اس طرح کے متعدد تاریخی اور علمی لطائف سے یہ تقریر بھری پڑی تھی۔ یہ تقریر دلپذیر سننے کے بعد گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، کہ مولانا کبھی قومیت متحدہ کا علم بھی اپنے دوش ناتواں پر لہراتے ہوئے سرمہ اہل نظر ثابت ہوں گے، لیکن یہ زمانے کے انقلابات ہیں اور اس طرح کی تبدیلیاں انسانوں میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

میرے تغیّر رنگ پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے!

۱۹۳۲ء میں تھانہ بھون سے واپسی پر چند گھنٹہ کے لیے دیوبند بھی جانے کا اتفاق ہوا، مولانا طیب صاحب مہتمم دار العلوم کے نام مولانا عبد الماجد نے ایک تعارفی خط دے دیا تھا، اس خط نے بڑا کام دیا۔ مولانا طیب صاحب شاہ محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں ہیں اور اپنے اسلاف کرام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کا انکسار ان کی تواضع ان کی مہمانداری ہر چیز میں قدامت کی دلہا شان نظر آتی ہے، باتیں سنئے! جیسے نغمۂ فردوس، صورت دیکھئے تو معلوم ہو،

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مولانا طیبؔ کی عنایت سے دار العلوم کے حلقہ ہائے درس کے دیکھنے کا بھی مجھے موقع ملا، اور میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ مشرق کی اس مایۂ ناز درسگاہ کے معائنہ اور مشاہدہ کی مجھے سعادت حاصل ہوئی، مولانا حسین احمد صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کا مجھے اتفاق ہوا، مولانا حدیث کا درس دے رہے تھے، مولانا سے سیاسی اختلافات کسی کو خواہ کتنے ہی ہوں لیکن ان کے علم و فضل تقدس وسعت نظر اور تقویٰ کے سب قائل ہیں۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ اس حلقہ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا، اور مولانا کی تدریس کا انداز دیکھا۔ علوم اسلامیہ میں سب سے زیادہ اہم اور نازک فن حدیث ہی کا ہے، لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مولانا ایں ہمہ فضل و کمال ڈاکٹر ضیاء الدین بن کر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے بہترین ماہر تعلیمات ہیں، لیکن سارا وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں، مولانا مایۂ ناز محدّث ہیں، لیکن سیاسی اشتغال میں ایسے الجھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کے فضل و کمال سے طلبہ پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے، کاش! مولانا کی سرگرمیاں صرف دیوبند تک محدود رہتیں!

مولانا سیّد سلیمان ندوی

"مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں"

میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ندوہ میں داخل ہوگیا، یہاں کی دنیا ہی دوسری تھی، دوسرے عربی مدارس کی طرح یہاں وہ گھٹن اور وہ چبھن نہیں تھی جس سے عام طور پر عربی مدارس کے طلبہ دوچار رہتے ہیں نہ یہاں وہ عہد مظلم کی تاریکیاں اور پابندیاں تھیں جن سے عام طور پر مدارس عربیہ کے طلبہ کو سابقہ پڑتا رہتا ہے نہ یہاں وہ اعتکاف و اعتزال کا عالم تھا جو عام طور پر عربی مدرسوں کا طرّۂ امتیاز تھا، نہ یہاں اساتذہ اور طلبہ کا معاملہ "بین الخوف والرجا" معلق تھا، جیسا کہ عام طور پر عربی درسگاہوں میں ہوتا رہتا ہے، یہاں روشن خیالی اور تیز خرامی تھی، زندگی اور زندہ دلی تھی، شوخی اور بذلہ سنجی تھی، بے تکلفی اور یار باشی تھی، اجتماعیت اور مجلس آرائی تھی، والی بال تھا، فٹ بال تھا، ہاکی تھی، بین المدارس میچ تھے جلسے تھے، پارٹیاں تھیں، جلوس تھے، مظاہرے تھے، مشاعرے تھے، مقابلے تھے، اور نماز کے وقت نماز، کھیل کے وقت کھیل، تعلیم کے وقت تعلیم، ندوہ میں سب سے زیادہ عظیم، محبوب اور دل آویز شخصیت مولانا سیّد سلیمان ندوی کی تھی، وہ دار المصنفین کے ناظم کی حیثیت سے اعظم گڑھ میں مقیم تھے، کبھی کبھی ندوہ آتے تھے، دوچار روز رہ کر چلے جاتے تھے معتمد تعلیمات وہی تھے ندوہ کے تعلیمی امور کا آخری فیصلہ انہی کے ہاتھ میں تھا، اب تک میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا نام سنا تھا، ایک روز مغرب کے بعد میں کھانے کی گھنٹی کے انتظار میں ٹہل رہا تھا، آگے آگے میرے ایک ہم وطن سیّد اختر حسین خیر آبادی تھے، سامنے سے ایک مولانا برآمد ہوئے، نہایت سیاہ داڑھی، سر پر نہایت خوبصورت سفید صافہ ہاتھ میں خوشنما چھڑی خوب رُو خوش قامت، خوش لباس، پتلے پتلے ہونٹ، بارعب باوقار آواز، انہوں نے اختر کو ٹوکا۔ "السلام علیکم"، انہوں نے مرعوب ہوکر وعلیکم السلام کہنے کے بجائے ادب سے ہاتھ اٹھا کر

سلام کا جواب دیا۔ مولانا نے رعب دار آواز میں دریافت فرمایا "کیا آپ کا منہ بسلا ہوا ہے" اس عجیب و غریب سوال نے اختر کو بالکل حواس باختہ کر دیا، انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بات نہ بڑھائیں اور بغیر جواب دیئے ہوئے کترا کے نکل جائیں۔ مولانا نے ان کا ارادہ بھانپ لیا، اور پھر سوال کیا "کیا آپ بدتمیز بھی ہیں؟" اب ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ اس طرح خاموش کھڑے ہو گئے، جیسے شیر کے سامنے بکری۔ رحم اور ترس کی کیفیت اپنے چہرہ پر طاری کئے بغیر مولانا نے پھر پوچھا، اور بالکل قریب آ کر پوچھا "کیا آپ داڑھی مونچھ منڈاتے ہیں؟" حالانکہ وہ سبزہ آغاز تھے مگر گھبراہٹ میں "جی" کہہ گئے۔ اب ذرا درشتی کے ساتھ مولانا نے پوچھا "اسی لیے آپ یہاں آئے ہیں؟" اختر صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پہلے والے سوال کا جواب دیتے ہوئے خود ایک سوال کر ڈالا "میرے داڑھی مونچھ ابھی نکلی کہاں ہے؟" اس اثنا میں کچھ بڑے طلبہ بھی آ چکے تھے، انہوں نے آتے ہی مولانا کو گھیر لیا، اب وہ ان کے ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف چلے، راستہ میں کسی سے پوچھا "قال، اصل میں کیا تھا؟ کسی سے دریافت کیا "مفعول مالم یسم فاعلہ" کی مثال کیا ہے؟ کسی سے پوچھا "کلمہ حرف وضع لمعنی مفرد" میں "مفرد" کے دال کو زبر دیں گے یا زیر یا پیش؟ زبر دیں گے تو کیوں؟ زیر دیں گے تو کس کے لیے؟ اور پیش دیں گے تو اس کی وجہ بیان کرو، یا اس حرف پر تینوں اعراب صحیح ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو بھی اس کا سبب معلوم ہونا چاہیئے، اسی قسم کے سوالات کرتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچ گئے، اب معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی یہی ہیں۔

چھوٹے طلباء پر سید صاحب کی اور ان سے زیادہ ان کے برجستہ سوالات کی دہشت چھائی تھی، اور بڑے طلبہ بھی ان سے اور ان سے زیادہ ان کی شخصیت سے مرعوب تھے، دہشت زدگان میں میں بھی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ میں درجہ اوّل سے چہارم میں پہنچ گیا، مگر سید صاحب کی اور اپنی مڈبھیڑ میں نے نہ ہونے دی، لیکن اب میں نمایاں ہو چکا تھا، اور میرا ان کا آمنا سامنا ناگزیر تھا۔

چنانچہ میرا اور سید صاحب کا پہلا سامنا منفی صورت میں ہوا، درس جاری تھا وہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے معائنہ کے لیے تشریف لائے اور طلبہ سے متعدد سوالات شروع کر دئے جس نے صحیح جواب دیا، اس سے اور ٹیڑھا سوال کیا، جس نے غلط جواب دیا اس کی سرزنش

شروع ہو گئی، اب سید صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے، انہیں زحمت سے اور اپنے تئیں مصیبت سے بچانے کے لیے میں نے ایک اہم فیصلہ کیا، یعنی ان کے سوال کا جواب دیا "مجھے نہیں معلوم"، انہوں نے جتنے سوالات کیے سب کا جواب ایک ہی تھا، اس جواب سے سید صاحب خفا تو بہت ہوئے، لیکن ظاہر ہے معاملہ یہیں ختم ہو گیا، اور اب اس کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ تھا، اور یہی میرا مقصد تھا۔

ایک روز رات کو کھانے کے بعد بورڈنگ کا دورہ کیا، میں اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، آج شفقت کا رنگ غالب تھا۔ آئے مسکرائے پوچھا، حضرت میں مومن کی شاعری پر آپ نے مضمون لکھا ہے؟"، میں نے اثبات میں جواب دیا، پسندیدگی کا اظہار فرمایا، کہا، نواب صاحب نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے، لیکن آپ کو ادبی مضامین کے بجائے علمی مضامین لکھنے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے، میں نے عرض کیا جو کچھ اپنی محنت اور مطالعہ سے حاصل کر سکتا تھا، اس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے، جس چیز کے لیے تعلیم کی تربیت کی رہنمائی کی ضرورت ہے اسے میں از خود کیونکر کر سکتا ہوں، آپ سکھائیے، علمی مضامین لکھنا، میں لکھوں گا۔ ڈر تھا، اس جواب سے برہم ہو جائیں گے، لیکن خلاف توقع بہت خوش ہوئے، بیٹھ گئے اور علم و ادب سے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمانے لگے۔

کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ سید صاحب بار بار ندوہ آئے، تھوڑے تھوڑے وقفوں سے آتے رہے اور طویل قیام کرتے رہے، دوران قیام میں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ بالخصوص تفسیر قرآن کا میں بھی اس حلقہ میں شریک تھا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ ندوہ کی سیاسیات میں، میں اب بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا تھا، سید صاحب سے زیادہ قرب حاصل ہوا، اس قرب نے میرے دل میں ان کی عظمت پیدا کر دی۔

نگار کے ایک پرچہ میں میرا ایک مضمون شائع ہوا، یہ جواب تھا نیاز صاحب کے بعض اعتراضات کا، سید صاحب اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھے، یہ مضمون دیکھ کر ان کی شفقت اور بڑھ گئی، بہت خوش ہوئے، فرمایا بہت اچھا مضمون ہے، لیکن دلائل کی اور زیادہ گنجائش تھی، میں نے عرض کیا، بجا فرمایا، لیکن یہ علمی مضمون بھی میں نے بغیر رہنمائی کے لکھا ہے، آپ تنقید و مشورہ کے بجائے تربیت کیجیے، میں کوتاہی کروں تو شکایت

تقدس اور پاکیزگی کا رعب بیٹھ رہا تھا، وہ قرآن کی تفسیر پڑھاتے تو ایسا معلوم ہوتا، اس فن کے امام ہیں، وہ فلسفہ قدیمہ پر گفتگو کرتے، تو اندازہ ہوتا ــــ یہ فن بھی

روندا ہوا ہے کوکبۂ شہریار کا

وہ صرف نحو پر باتیں کرتے تو معلوم ہوتا سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، وہ ادب عربی فصاحت و بلاغت پر گفتگو کرتے تو اندازہ ہوتا جاحظ اور جرجانی سامنے موجود ہیں، فلسفہ کے ہمارے مولانا حفیظ اللہ صاحب مسلم اور مستند استاد تھے، بوعلی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ درس میں تھی، اور وہی پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ اس کتاب کا ایک سبق سید صاحب نے پڑھایا، آنکھیں کھل گئیں علم کیا ہوتا ہے، علم کی گہرائی کیا ہوتی ہے، یہ آج معلوم ہوا، حدیث کے فن میں مولانا حیدر حسن صاحب مغفور امام وقت تھے، لیکن سید صاحب اگر بخاری یا مسلم کے درس میں کبھی اپنے نکات بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں سید صاحب نے صرف کی ہے، فقہ اور اصول فقہ میں مولانا شبلی فقیہہ مرحوم کا کوئی ہمسر نہ تھا، لیکن طبیعت حاضر ہوتی تو اس فن پر سید صاحب کے معلومات حیرت انگیز ثابت ہوتے، غرض کوئی فن ایسا نہ تھا، جس پر سید صاحب درس نہ دے سکتے ہوں اور اسرار و غوامض کی عقدہ کشائی نہ کر سکتے ہوں، پھر ان سب کے ساتھ مذہبیت نظری نہیں عملی، نماز بھی اور تسبیح و تہلیل بھی ذکر و شغل بھی، اور پھر مذہبیت کے ساتھ تقدس، سیاہ داڑھی اب سفید نورانی داڑھی میں تبدیل ہو چکی تھی، ذرا ذرا سی باتوں میں تقوے اور خشیہ کی کارفرمائی، پھر تقدس کے ساتھ حب رسولؐ کی نعمت سے مالا مال ساری عمر سیرۃ النبیؐ لکھنے میں گزار دی، اور اس موضوع پر ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا تیار کر دی، دنیا کی کسی زبان میں حتیٰ کہ عربی میں بھی سیرۃ نبوی پر اتنا معتبر، مستند اور بہترین ذخیرہ یکجا نہیں ملے گا۔ یہ مذہبیت یہ تقدس، حب رسولؐ بالا بالا نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ وقت کے مشہور صوفی حضرت شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رویا کی بنا پر بشارت دی، کہ دربار نبوی میں یہ کتاب مقبول ہو چکی ہے۔

اے خوشا روزے و خرم روزگارے!

۱۹۳۰ء کی عظیم الشان اسٹرائک میں سید صاحب بغیر بلائے ہوئے تشریف لائے اس معاملہ فہمی، محبت، شفقت اور اپنائیت کے ساتھ گفتگو کی کہ معاملات سلجھ گئے، طلبہ سٹرائک ختم کر دینے پر راضی ہو گئے، لیکن سید صاحب کا فارمولا نواب صاحب نے نہ مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ سٹرائک

کیجئے، لیکن آپ توجہ نہ کریں پھر بھی میں کچھ نہ کچھ کرتا رہوں تو آپ کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، آپ کو مولانا شبلی نے بنایا، لیکن مجھے، مجھی کو نہیں، ہمیں کون سکھاتا ہے؟ کوئی نہیں، آپ مہمان کی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، آپ ممتحن کی طرح امتحان لیتے ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں کرتے، آپ اُستاد کی طرح ہمیں سکھاتے نہیں، بتاتے نہیں، پڑھاتے نہیں۔ میں بڑے جوش میں تھا، عبدالسلام قدوائی اور حامد علی بھی موجود تھے، یہ گفتگو دراصل نئے گاؤں میں ہوئی تھی، جہاں انہیں حضرراہ کی طرف سے عصرانہ دیا گیا تھا، اور جس میں صرف ہم چند آدمی شریک تھے، میری باتیں سن کر عبدالسلام کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ خوف و دہشت کے عالم میں ان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لیکن سید صاحب نے ایک جاں نواز اور دلربا تبسم کے ساتھ اپنے نہایت ہی مخصوص لب و لہجہ میں فرمایا۔ ماشاءاللہ!، مجھے سید صاحب سے سب سے بڑی شکایت یہی تھی، ۔ اور اب تک ہے۔ کہ وہ لوگوں کو تیار نہیں علامہ شبلی نے ندوہ سے سید سلیمان، عبدالسلام مسعود علی وغیرہ کو پیدا کیا، اور سید صاحب علامہ شبلی کی پیداوار کے مقابلے میں، اب تک کسی سید سلیمان، کسی عبدالسلام کسی مسعود علی کو نہ پیدا کر سکے، حالانکہ سید صاحب کے مقابلہ میں علامہ مرحوم مکروہات دنیا میں زیادہ پھنسے ہوئے تھے، لہٰذا جب کبھی مجھے موقع ملتا تھا میں یہ شکایت بے جھجک ان کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا، اور وہ پوری شفقت اور مرحمت کے ساتھ میری شکایت سُن لیتے تھے۔

میں پان کھانے کا ہمیشہ سے عادی ہوں، سالانہ امتحان ہو رہا تھا، میں کاپی پر جوابات لکھ رہا تھا، اسٹیج پر شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اور سید صاحب وغیرہ رونق افروز تھے، ایک پان میرے منہ میں تھا اور کئی پان کاغذ کی ایک پڑیا میں لپیٹے ہوئے سامنے رکھے تھے پان میں تمباکو بھی تھا، اس لیے پیک کا تھوکنا ناگزیر تھا، میں نے اصغر (چپراسی) سے کہا "اگالدان لاؤ!"، وہ دفتر سے اگالدان لایا، اور میرے سامنے رکھ دیا، سید صاحب نے یہ حرکت دیکھ لی، فوراً تشریف لائے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کتنے پان کھاتے ہیں"، میں نے پوری سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، دو روپیہ مہینے کے، اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

اب میں درجہ ششم میں پہنچ چکا تھا، اب تک میں سید صاحب کی شخصیت اور ان کی قدر و قیمت سے پورے طور پر واقف نہیں تھا، لیکن اب دل میں ان کی قابلیت، ہمہ دانی، ہمہ گیری

ٹوٹتے ٹوٹتے بھرپوری شدت کے ساتھ جاری ہوگئی۔

اس اسٹرائک کے سلسلہ میں عبدالسلام قدوائی اور راقم الحروف ممنوع الادخال ہو چکے تھے لیکن بعض عہدہ داران دارالعلوم کی سخت مخالفت کے باوجود سید صاحب نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیکر ہم دونوں کے داخلہ کا حکم دے دیا، بعد میں یہ حکم نواب صاحب نے منسوخ کر دیا۔ اب سید صاحب بے بس ہوگئے انہوں نے ایک پُرزور سفارشی خط لکھ کر ہمیں جامعہ بھیج دیا، یہی نہیں جامعہ کے دور ابتلا میں ہمدردی و محبت شفقت و مرحمت، تسکین و تسلی سے بھرے ہوئے کئی خط آئے، بعض خطوں میں تو اپنی جیب خاص سے مالی امداد تک کرنے کے عزم کا اظہار تھا، دلی سے لکھنؤ اکثر آنا ہوتا رہتا اور سید صاحب سے ملاقات بھی اکثر ہوتی رہتی، گھنٹوں اور پہروں ندوہ کے مستقبل پر اس کے تعمیری مسائل پر گفتگو فرماتے کہیں سے یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ دل میں گزشتہ خام کاریوں، اور گستاخیوں کی یاد باقی ہے رحمت اور عطوفت کا ایک سیل رواں تھا جو ہر بھی کو، ناراضی کو، خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا تھا، باغی دل نے یہ سلوک دیکھا، اور وہ عقیدت و عظمت کا مرکز بن گیا!

۴۴ء میں پھر ایک اسٹرائک ہوئی، بمبئی میں مجھے جو اطلاعات ملیں ان کی بنا پر ارباب انتظام کے خلاف میں نے پھر ایک مضمون لکھا، اس سیل خیالات کے دو ایک چھینٹے سید صاحب کے دامن تک بھی پہنچ گئے، بجائے خفگی اور برہمی کے، پر سٹیج، اور وقار کے خیال سے بے نیاز ہو کر ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا، جس میں اصل واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور آخری جملہ یہ تھا کہ "کیا تم بھی مجھے ایسا سمجھتے ہو، یعنی:

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

میں بہت متاثر ہوا، ندوہ کے مسئلہ میں بہت زیادہ جذباتی ہوں لیکن سنبھل گیا، سید صاحب کے خط کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اگر کوئی غلطی بھی کرتے ہیں، تو دیانتداری سے اور میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کے دکھے ہوئے دل کو نہ دکھاؤں، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس عزم پر قائم ہوں اور خدا سے دعا ہے کہ ہمیشہ قائم رہوں!

مولانا شبیر احمد عثمانی

طبقۂ علماء کی ایک برگزیدہ ہستی!

۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے، جامعہ ملیہ میں ایک روز غلغلہ مچا کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی تشریف لائے ہیں، اور لائبریری کے ہال میں ان کی تقریر ہوگی،

ہم سب اپنے اپنے درجوں سے نکل کر لائبریری کے ہال میں پہنچے، تھوڑی دیر میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی معیت میں گاڑھے کے لباس میں ملبوس دوہرا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، نورانی داڑھی، آنکھیں نیچی، لیکن چہرہ پر ایک رعب و جلال، آہستہ آہستہ خراماں خراماں ایک صاحب تشریف لائے، یہی جانشین شیخ الہند مفسر قرآن اور شارح حدیث مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔

ہم سب کو اشتیاق تھا کہ مولانا اپنی خطابت کے جوہر دکھائیں گے، الفاظ سے کھیلیں گے، اور فصاحت بیان و طلاقت لسان کے اعجاز کا مظاہرہ فرمائیں گے لیکن انہوں نے فرمایا، میں آپ کے سامنے کوئی تقریر نہیں کرنا چاہتا، صرف ایک بات کہتا ہوں، اسے تقریر سمجھ لیجیے، نصیحت سمجھ لیجیے، جو چاہے سمجھ لیجیے، وہ بات یہ ہے:۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے، اکثر احباب مایوس ہوئے کہ مولانا نے "تقریر" نہیں فرمائی، لیکن میرے دل نے کہا، کوئی تقریر بھی اس جامع و مانع تقریر سے مؤثر ہو سکتی تھی، ان چند الفاظ میں مولانا نے وہ کہہ دیا جو دوسرے لوگ گھنٹوں میں بھی نہیں کہہ پاتے۔

پھر ایک عرصہ گزر گیا، مولانا کا دیدار نہیں ہوا، ۱۹۳۹ء میں مسٹر قطب الدین صدیقی نے بمبئی میں خلافت کانفرنس کا اہتمام کیا، طے یہ ہوا کہ صدارت کی دعوت مولانا عثمانی کو دی

ائے، مولانا ڈوبھیل کی جامعہ اسلامیہ میں قیام پذیر تھے، یہ خدمت میرے اور جناب غازی
ی الدین صاحب اجمیری، آنریری سیکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی کے سپرد ہوئی کہ ڈوبھیل
ہیں، اور مولانا کو صدارت قبول کرنے کی دعوت دیں۔

ہم دونوں سورت اور راندیرا اور نوساری کی سیر کرتے ہوئے ڈوبھیل پہنچے یہ دیکھ کر خوشی
ئی کہ مغربی ہند میں علوم اسلامیہ وعربیہ کی تعلیم و تدریس کا اتنا بڑا اور شاندار دارالعلوم مولانا اور
ن کے رفقاء کار کی ہمت اور حوصلہ نے قائم کر رکھا ہے۔

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد، ہم دونوں باریاب ہوئے، اسلامی ہند کا یہ بہت بڑا مفسّر
ر شارح حدیث، مشہور خطیب اور بلند پایہ واعظ، فاضل اجل، اور علامہ بے بدل، فقہ و اصول
ماہر، اور دینیات و اسلامیات کا اُستاد، ایک معمولی سے کمرے میں ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا
ظر فریب فرنیچر تھا، نہ شاندار عمارت، لیکن اس سادگی میں بھی ایک جلال تھا، اس خاکساری
ں بھی ایک وقار تھا، اس فروتنی میں بھی ایک دبدبہ تھا۔

ہم لوگوں نے اپنے معروضات پیش کیے، مولانا نے اپنی علالت کا عذر پیش کیا ہمارا نیاز مندانہ
رار بڑھا، تو غایت درجہ وسعتِ قلب سے کام لے کر دعوت قبول فرمالی، اور وقت مقررہ پر بمبئی
ریف لے آئے۔

خلافت کانفرنس میں مولانا نے کوئی لکھا ہوا خطبہ نہیں پڑھا، ایک برجستہ تقریر فرمائی، جلسہ
ں مخالف بھی تھے اور موافق بھی، نکتہ چیں بھی اور مداح بھی لیکن سب کا عالم یہ تھا، کہ علم و معرفت
ے اس بحر مواج کا تلاطم دیکھ رہے تھے، اور محو حیرت تھے۔

تقریباً دو گھنٹہ تک مولانا کی تقریر جاری رہی، اس مدت میں مولانا نے حقیقت و معرفت
ے جو جواہر پارے بکھیرے، کوئی دامن ایسا نہ تھا، جو ان سے خالی رہا ہو، یہ معلوم ہوتا تھا
یاست اور شریعت کا ایک دریا ہے جو اُمنڈا چلا آرہا ہے، تاثر کی کیفیت یہ تھی، کہ سناٹا
یا ہوا تھا تقریر ختم ہونے کے بعد بھی، کچھ دیر تک دفور تاثر کی جو کیفیت لوگوں پر طاری
الفاظ میں یارا نہیں، کہ اس کی تصویر کھینچ سکیں۔

مُلّا طاہر سیف الدین

نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

بوہرہ قوم کے روحانی تاجدار، دنیاوی سردار، اور اس کی اصلاح و فلاح کے واحد ذمہ دار اور علمبردار ہز ہولی نس سیدنا مُلّا طاہر سیف الدین کے اسم گرامی سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، بوہرہ قوم ایک پراسرار قوم ہے، اس قوم کے افراد ملتے سب سے ہیں، شریک حال سب کے ہیں، معاشرتی طور پر بڑے خلیق، بامروّت اور مرنجاں مرنج ہوتے ہیں، لیکن ان کے اصل عقائد کیا ہیں؟ خیالات کیا ہیں؟ مذہبی بنیاد و اساس کیا ہے؟ معتقدات و خیالات کا سرچشمہ اور منبع کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب آپ کو کوئی بوہرہ نہیں دے گا، مسکرا کر بات ٹال دے گا، یا زیادہ صاف گو ہوگا تو کہہ دے گا، یہ باتیں ہم لوگ نہیں بتایا کرتے، آپ کو اگر زیادہ کاوش اور جستجو ہے، تو سراغرسانی سے کام لیجیے یا قیاس آرائی سے، کسی بوہرہ کی خدمات سے آپ اس سلسلہ میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

بمبئی آئے اور یہاں کے مستقل قیام کے بعد بوہرہ اصحاب سے ملنے جلنے کا بھی اتفاق ہوا، اور خوجہ صاحبان سے بھی، بوہروں کے پیشوا مُلّا صاحب ہیں، اور خوجوں کے سر آغا خان، یہ دونوں فرقے دراصل فرقۂ شیعہ کی شاخ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن دونوں کی تنظیم بھی جدا ہے، اور اصول حیات بھی، عامۂ مسلمین سے بھی یہ کچھ زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتے، بلکہ ایک حد تک کھچے کھچے، اور الگ الگ سے رہتے ہیں، اس کے باوجود مجھے یہ دیکھ کر تعجب آمیز مسرت ہوئی کہ بوہرہ اصحاب نسبتہً نماز کے زیادہ پابند ہیں، اس ترقی کے دور میں بھی داڑھی رکھتے ہیں، اور ذرا شرم نہیں محسوس کرتے، مذہب بیزاری، اور روشن خیالی کے اس "دور جدید" میں بھی، یہ "عہد عتیق" کے باشندے معلوم ہوتے ہیں، کوئی کام بغیر "امام" کی مرضی کے نہیں کرتے، مرگ و شادی تجارت اور کاروبار، سیاست اور اخلاق، غرض دین اور دنیا کے ہر معاملہ میں یہ اپنے امام کے

سچے پیرو اور جاں نثار معتقد ہیں۔

صرف یہی نہیں، امام کے دیدار کے متوالے، اس کے احکام کے پروانے، اس کے فرمان کے دیوانے، یہ تاجر قوم ہے، اس کے افراد لاکھوں کروڑوں روپیہ حکومت کو انکم ٹیکس، سوپر ٹیکس اور اکسس پرافٹ ٹیکس کی صورت میں دیتے ہیں، لیکن یہ لوگ بڑی خندہ جبینی سے "زکوات" کی رقم بھی نکالتے ہیں، اور ملاجی کے عائد کئے ہوئے دوسرے "محاصل" بھی ادا کرتے ہیں اور اس طرح "قیصر کا حق قیصر کو" دینے کے بعد "کلیسا کا حق کلیسا کو" بھی بڑی فراخدلی سے دیتے ہیں۔

اس قوم (خوجہ اور بوہرہ دونوں) کے مورث اعلیٰ حسن بن صباح صاحب قلعۃ الموط، اور ان کے یکتائے روزگار "فدائیوں" کی تاریخ سے، اسلامی تاریخ کا ہر متعلم واقف ہے مجھے نہیں معلوم آغا خان کے ہاں فدائیوں کا کوئی سلسلہ ہے۔ یا نہیں؟ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں، بوہروں میں اب تک ایسے فدائی اپنے امام کے موجود ہیں، جو اس کے ایک اشارہ پر یا بغیر کسی اشارہ کے اپنے جوش عقیدت سے مجبور ہو کر مخالف کی جان لے کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں، اور ذرا بھی نہیں جھجکتے۔

اس قوم کا وطن ہندوستان ہے، اس کے امام کا اپنے آبائی عرب سے اب کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا ہے، لیکن یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی، کہ ملا صاحب کی سرکاری زبان "عربی" ہی اب بھی ہے، ان کے ہاں سے احکام و مراسلات، فرامین و ارشادات ہدایات و نصائح غرض جو کچھ بھی شائع ہوگا، وہ عربی میں، یا کم از کم اس طرح کہ زبان گجراتی، مگر رسم الخط عربی، خود ملا صاحب عربی زبان کے صاحب طرز ادیب ہیں وہ عربی لکھتے بھی بہت اچھی ہیں اور بولتے بھی بہت اچھی ہیں، عربی میں شعر بھی کہتے ہیں، انداز کلام پر قدامت کا رنگ غالب ہے لیکن جہاں تک زور کلام ادبیت، اور فصاحت و بلاغت کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ ادیب کامل ہیں، ملا صاحب کی متوازی حکومت میں بہت سے عہدیدار ہیں، وزیر بھی ہیں اور مشیر بھی، ڈائرکٹر تعلیمات بھی، اور پولیٹیکل ایڈوائزر بھی، ان کا ایک مستقل نظام ہے، کئی سو مدرسے اس نظام کے ماتحت چلتے ہیں، ہزاروں آدمیوں کی استحقاق کی بنا پر مالی امداد کی جاتی ہے، اور مستحقوں سے امداد بھی لی جاتی ہے، ملا صاحب کا باقاعدہ دربار لگتا ہے، اور اس میں اپنے اپنے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق لوگ نشست پاتے ہیں، عوام کے جوش عقیدت کا یہ حال ہے کہ وہ صرف دیدار کیلئے اپنا سب کچھ لٹا دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، سرمایہ داروں کے

طبقہ میں ملّا صاحب کے عائد کیے ہوئے محاصل کی ادائی میں کچھ ہلچل ہوتو ہو لیکن عوام ان محاصل کو گھر کی پونجی بیچ کر بھی ادا کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

بوہروں میں ایک جماعت مخالفین کی بھی پیدا ہو چکی ہے، جو ایک عرصہ سے اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہے، اس جماعت کے سرکردہ سر آدم جی بھائی تھے لیکن انہیں اپنی قوت کا بہت غلط اندازہ تھا، مقابلہ کر کے اس طرح تباہ ہوئے کہ آج ملّا جی کے تصرفات روحانی میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

دل میں ایک عرصہ سے اشتیاق تھا، شرف نیاز حاصل کرنے کا، لیکن

راہ میں وہ ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

ایک مرتبہ بالکل اچانک ملاقات ہوگئی، یہ واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے،

میں فورٹ سے واپس آ رہا تھا، کہ ایک دوست راستہ میں ملے، انہوں نے کہا آپ سے ملّا صاحب کے وزیر تعلیمات ملنا چاہتے ہیں، چلئے ذرا ان سے مل لیجئے، بدری محل ملّا صاحب کا سامنے ہی تھا، میں نے بغیر کسی تامّل کے کہا، چلئے۔

وزیر تعلیمات صاحب بہت اخلاق سے پیش آئے، اور سیاسی و مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے، میرے بعض مقالات ان کی نظر سے گزرے تھے اور وہ انہیں پسند آئے تھے اسی لئے انہوں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا، میری ان کی ملاقات ابھی جاری تھی کہ بدری محل میں ایک ہل چل سی مچ گئی، اتنے میں نقیب نے گرجدار آواز میں نعرہ لگایا "امام المومنین خلیفۃ المسلمین، اعلیحضرت سیّدنا ملا طاہر سیف الدین تشریف لاتے ہیں، ایک ہیبت سی چھائی ہوئی تھی، بدری محل کے در و دیوار پر اتنے میں، میں نے دیکھا، ملّا صاحب اپنے جان نثاروں اور فدائیوں کے ساتھ اپنے کورٹ میں چلے گئے، معلوم ہوا کہ نماز فجر و عصر کی امامت ملّا صاحب یہیں فرماتے ہیں۔

دل میں شوقِ ملاقات کا پرانا جذبہ پھر ابھرا، میں نے بے تکلف وزیر تعلیمات صاحب سے عرض کیا، میں ملا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، وہ فوراً مجھے اپنے کمرہ میں چھوڑ کر ملّا صاحب کے پاس پہنچے، اور ان سے اجازت لے کر آئے، اور مجھے لے گئے۔

ایک نہایت وسیع اور کشادہ کمرہ، سادہ فرش، ملّا صاحب اتنے بڑے کمرہ میں تن تنہا

مولانا عبدالماجد دریابادی

ایک کامل العیار انسان

ایک زمانہ تھا کہ مولانا عبدالماجد ایک بہترین ادیب اور انشا پرداز، ایک صاحب طرز مصنف اور مؤلف، ایک سنجیدہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور اعام اور مرجع خواص بنے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ مذہب کے منکر تھے، ارتیاب، تشکک، اور الحاد و دہریت کے علمبردار تھے، لیکن ان کی لامذہبی، آزاد خیالی اور "ترقی پسندی" بھی اپنے اندر ایک آن رکھتی تھی، اس میں ایک وزن تھا وقار تھا، وہ مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے تھے، اس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے، انھوں نے علامہ شبلی کی "الکلام" پر ایک تنقیدی نظر" "ایک طالب علم" کی حیثیت سے ڈالی، اور سنجیدگی، متانت، اور وقار علم کے ساتھ ان کے مذہبی دلائل کی ایسی مخالفت کی، کہ وہ بھی ان کی ذہانت، قوت فکر اور جولانی طبع کے قائل ہو گئے۔

پھر وہ دور آیا، کہ

وہی ریاض جو تھے بت پرست و بادہ پرست
خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے؟

مذہب نے ان پر اثر کیا، اور ان کا اوڑھنا بچھونا مذہب بن گیا، تاریخ ہو یا فلسفہ، سیاست ہو یا معاشرت ہر چیز کو وہ خالص اسلامی حیثیت سے دیکھنے اور پرکھنے لگے، داڑھی مونڈی تھی بڑھ گئی، کوٹ پتلون نے کنارہ کشی اختیار کر لی، موٹے کھدر کا کرتہ اور پاجامہ، ٹوپی اور عبا ان عناصر اربعہ نے مستقل لباس کی صورت اختیار کر لی، بزم و انجمن کی رنگینیاں رخصت ہو گئیں مسجد و خانقاہ سے دل ملنے لگا، علوم عصریہ اور افکار جدیدہ اور حوادث حاضرہ کے مطالعہ و مشاہدہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن زیادہ وقت اب صرف ہونے لگا، قرآن پر تفسیر پر، حدیث رسولؐ پر، سیرت نبویؐ پر، حیات صحابہ و تابعین پر، پہلے فلسفہ پر ایک فن کار کی

گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، میں سامنے پہنچا، مسکرا کر خیر مقدم کیا، اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، پھر اشارہ کر کے اپنے پاس بٹھا لیا، نحیف و نزار جسم، عمر پچاس سے متجاوز، آواز میں ملائمت اور شیرینی، انداز گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا، ایک بلند پایہ شخصیت ہے، جسے اپنے مجدد وقار کا بہت خیال ہے، اور اپنی گفتگو، حرکات، سکنات عمل، ہر چیز میں اس مجدد وقار کی شان اور آن باقی رکھنا چاہتی ہے، کلام میں پیش قدمی خود کم کرتے تھے، جواب میں خاموشی کی ساری کسر اپنے اخلاق سے نکال دیتے تھے۔

دس پندرہ منٹ بیٹھ کر میں نے اجازت چاہی، جب میں رخصت ہونے لگا تو ایک صافہ مجھے مرحمت ہوا، یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ ملا صاحب نے نوازش فرمائی۔ سرفراز فرمایا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے کئی بار سوچا، ملا صاحب جس نظام کے حامل ہیں، اس میں کچھ شخصی اور ذاتی خرابیاں ہوں یہ الگ چیز ہے، لیکن اس کی افادیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن کیا اس نئے زمانہ میں یہ پرانا نظام زندہ رہنے کی سکت رکھتا ہے؟

حیثیت سے لکھتے تھے، اب اس فن کو ایک بڑے مقصد۔ اسلام۔ کی تائید میں صرف کرنے لگے، جب تک لامذہب تھے، دوسروں کو اپنانے سے بے نیاز تھے "مسلمان" ہوئے، تو ساری دنیا کو اسی دین پر عمل پیرا دیکھنے کی آرزو کرنے لگے، قلم میں قدرت نے بے پناہ کشش اور قوت ودیعت کر دی تھی "فلسفہ جذبات"، ہو یا "تصوف اسلام" یہ کشش ہر رنگ میں موجود ہے۔

مجھے جب کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور میں ان کے نام نامی و اسم گرامی سے واقف ہوا، تو یہ مسٹر سے مولانا بن چکے تھے، کچھ دنوں کے بعد ان کا یگانہ اور منفرد اخبار "سچ" جس کا نام اب "صدق" ہے ___ نکلا، پہلا نمبر دیکھا، طرز تحریر ایسا بھایا کہ میں اس کے مستقل قارئین میں شامل ہو گیا، ان کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف کو والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتا، مجنونانہ جوش و خروش کے ساتھ دوستوں کو سناتا۔

یوپی کی حکومت نے، ہندوستانی اکادمی کے نام سے ایک علمی و ادبی ادارہ قائم کیا، اس کے جو ممبر سرکار نے نامزد کئے، ان میں مولانا عبدالماجد بھی تھے مجھے ایک سرکاری ادارہ میں ان کی شرکت پسند نہ آئی، جذبہ عقیدت کو ٹھیس سی لگی، فوراً ایک خط لکھا کہ "آپ محرم کے زمانہ میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ حسین ابن علی کے نقش قدم پر چلیں، باطل کا مقابلہ کریں اور ناحق سے برسر جنگ ہوں، یزید کے لشکر اور دہشت سے مرعوب نہ ہوں دوسری طرف خود آپ وقت کے یزیدوں اور فرعونوں کے بنائے ہوئے اداروں میں شریک ہوتے ہیں، آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے؟ . . . یہ خط میں نے "مقتدر حسین جعفری" کے نام سے لکھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا انہیں میرا نام معلوم ہو، ورنہ اگر انہوں نے سید صاحب یا ناظم صاحب سے شکایت کر کے ندوہ سے میرا نام خارج کرا دیا تو اور مصیبت آئے گی، دوسرے پرچہ میں "مقتدر حسین صاحب جعفری" سے خطاب کیا گیا، کہ آپ اپنا پتہ لکھئے تو آپ کو جواب دیا جائے گا! میں نے اپنے دوست حامد علی مدیر "خضر راہ" کے ذریعہ جواب مانگا، جواب آیا، ملاقات کیجئے، تو گفتگو ہو، اب مقتدر حسین کا حجاب حائل اٹھتا نظر آ رہا تھا، بڑی کشمکش میں تھا ملوں یا نہ ملوں؟ آخر ہر چہ بادا باد کہہ کر، میں نے پھر ایک خط لکھا کہ میرا نام مقتدر حسین نہیں، رئیس احمد ہے، میں ندوہ کا طالب علم ہوں، مصلحتاً میں نے نام بدل دیا تھا، اگر آپ خفا نہ ہوں تو ملنے آؤں، فوراً جواب آیا "خفا؟ آپ ایک نوعمر عزیز کی حیثیت سے ملنے

آیئے، خفگی کی کیا بات ہے؟"

اب فرا ڈھارس بندھی، اور دوسرے روز، خاتون منزل ـــ گولہ گنج ـــ میں پہنچا، اوپر اطلاع کرائی، تھوڑی دیر کے بعد طلبی ہوئی، دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر پہنچا، بزرگانہ شفقت اور محبت سے پیش آئے، دہشت نکل گئی، انس سا پیدا ہوگیا، میں نے دیکھا، ایک ہاتھ زخمی سا نظر آرہا ہے، پٹی بندھی ہوئی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا، عہد طفلی میں ہاتھ پر اپنا نام گدوالیا تھا پھر تجدید اسلام کے بعد کتب مذہبی میں اس کے خلاف وعیدیں دیکھیں، فوراً ڈاکٹر کو بلایا، ہاتھ اس کے سامنے بڑھا دیا، کہ اس کئی انچ کے لمبے اور چوڑے حصہ کی اتنی پوری کھال کو کھرچ دو، تراش دو، ڈاکٹر نے افہام و تفہیم کی کوشش کی، لیکن ناکام ہوا، اور آخر اسے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی ـــ یہ وہی زخم تھا جس کی کئی دنوں سے ڈریسنگ ہورہی تھی اور جس کے مندمل ہونے میں ابھی کئی ہفتوں کی مدت باقی تھی، زخم دیکھ کر، اور زخم سے زیادہ یہ عزم و استقامت فی الدین دیکھ کر میرے تو واقعی رونگٹے کھڑے ہوگئے، دل نے کہا، یہ ہے وہ خضر راہ، تحت الشعور میں جس کی تلاش تھی خوبیٔ قسمت دیکھئے آج وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

ڈریسنگ اور علاج کے سلسلہ میں جب تک مولانا لکھنؤ میں مقیم رہے، میں بڑی پابندی اور کثرت سے ملتا رہا، رفتہ رفتہ وہ تعلق پیدا ہوگیا، جو ایک خادم اور مخدوم میں، خورد اور بزرگ میں ہوتا ہے، اور خدا کے فضل سے یہ تعلق اور اختصاص روز بروز پائندہ تر اور مستحکم تر ہوتا گیا۔

میں گیا تھا ایک باغی کی حیثیت سے، واپس آیا تو دل عظمت اور محبت کا سرچشمہ بن چکا تھا۔

مولانا کی تربیت کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ مخاطب کو "عبد ذلیل"، اور اپنے تئیں "رب جلیل" سمجھ کر گفتگو نہیں کرتے، نہ گفتگو میں واعظانہ اور ناصحانہ رنگ غالب ہوتا ہے، وہ باتوں باتوں میں نہایت سادگی کے ساتھ، اپنا خیال اس طرح آپ کے دل میں پیوست کردیں گے کہ وہ آپ کا خیال بن جائے گا، کچھ عرصہ تک اگر ان کے فیض صحبت سے کسی کو مستفید ہونے کا موقع ملے، تو وہ ان کی آنکھوں سے کچھ دیکھنے لگے گا، ان کے کانوں سے سننے لگے گا۔ ان کے دماغ سے سوچنے لگے گا اس لیے کہ یہ اس دلسوزی اور اپنایت سے شکوک دور کرتے ہیں، اس خلوص اور سچائی سے دلائل پیش کرتے ہیں، اور تحقیق اور تفصیل سے بصورت مسلسل گفتگو

کرتے ہیں، کہ ان کی بصارت مخاطب کی بصارت بن جاتی ہے، ان کی ذکاوت اس کی ذکاوت بن جاتی ہے، یہ اپنے خیالات کسی پر ٹھونستے نہیں، اپنے خیالات کا جال اس خوبی سے پھیلاتے ہیں، کہ اس سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں، نثر میں "رعایت لفظی" اس کمال سے یہ استعمال کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا مزا آجاتا ہے، طرز تحریر اتنا دل نشیں کہ

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ایسا ہی رکھیں گے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو، ایک ہی قلم ہے جس نے "تاریخ اخلاق یورپ" بھی لکھی، اور "فلسفہ جذبات بھی" جس نے "تصوف اسلام" بھی لکھی، اور فلسفہ اجتماع" بھی جس نے "مثنوی بحر المحبت (مصحفی)" بھی مرتب و مہذب کی، اور "مقالات برکلے" بھی، جس نے "سفر نامہ حجاز" بھی لکھا، اور جو "سچی باتیں" بھی لکھتا ہے، ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان سے قائم ہے، طرز تحریر کہیں معلم کا ہے، کہیں مترجم کا، کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا کہیں ادیب کا، تاریخ اخلاق یورپ، شستہ اور رواں ترجمہ ہے، فلسفۂ جذبات، اور فلسفۂ اجتماع کا انداز تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے، تصوف اسلام اور فیہ ما فیہ، میں تصوف کی متانت غالب ہے، سفر نامہ حجاز میں قلم ایک ایسے مصور کا موقلم بن جاتا ہے، جو دل کے جذبات کو، تصور کی نقش آرائیوں کو عقیدت اور احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

فلاسفہ کی خشک مزاجی علما کی تمکنت اور صوفیا کی
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

مشہور ہے، ہمارے مولانا ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، عالم بھی ہیں، اور صوفی بھی، ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، صوفی کا سکوت سب کچھ ہے، لیکن حد کے اندر، ان سے آپ گفتگو کیجیے، انکی مجلس میں بیٹھیے، کسی طرح ان سے قرب کا شرف حاصل

کر لیجیے، پھر آپ دیکھیں گے، یہ ملک کا بہت بڑا فلسفی کتنا شگفتہ مزاج ہے، یہ قرآن کا مترجم اور مفسر کتنا بذلہ سنج ہے، یہ اسرار تصوف کا رمز آشنا، اپنی گفتگو میں شوخی کی چاشنی طنز کے تیر، رعایت لفظی کی صنعت غرض کیا کچھ نہیں رکھتا؟ پھر موقع موقع سے اساتذہ کے اشعار ہر رنگ شاعری کے اداشناس، مثنوی مولانا روم سے لے کر، اقبال کے ارمغان حجاز تک، اور میر سے لیکر مثنوی زہر عشق تک، حالی سے لیکر اکبر تک، امانت سے لے کر داغ تک، ہر استاد کے اشعار یاد۔

ادب ہو یا لٹریچر، فن ہو یا آرٹ، مشین ہو یا آلہ، اخبار ہو یا رسالہ، کتاب ہو یا مخطوطہ، سیاست ہو یا صحافت، یہ سب سے اپنا کام لیتے ہیں۔ کسی کے آلہ کار نہیں بنتے، ریڈیو رکھتے ہیں، لیکن صرف خبریں اور مضامین سنتے ہیں، کبھی کبھی سینما بھی دیکھتے ہیں، لیکن حظ نفس کیلئے نہیں شیطان کی ترتیاں دیکھنے کے لیے لندن اور امریکہ کے نسوانی رسالے، خیاطی کے میگزین، آرٹسٹوں اور فن کاروں کے صحائف دیکھتے ہیں، اور بغور دیکھتے ہیں، لیکن صرف اس لیے کہ معلوم کریں مغرب کا اخلاقی زوال کس حد عروج تک پہنچ چکا ہے، نت نئے فیشنوں نے کیسے بھیانک اقتصادی اور اخلاقی زوال کی بنیاد ڈال دی ہے، آرٹ اور فن کے نام پر، آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں؟

علماء کا احترام کرتے ہیں، بزرگوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن تقلید اعمیٰ سے گریز کرتے ہیں، اور اپنی رائے بے خوف لومۃ لائم، پورے استقلال و استقامت بیباکی اور صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں، نہ جھجکتے ہیں نہ تامل کرتے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں، لیکن سیاسیات میں ان کے مسلک سے سخت اختلاف رکھتے ہیں، اور اس کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے، مولانا اشرف علی ان کی نظر میں "حکیم الامت" تھے، تھانہ بھون ہر سال کسب فیض کے لیے جایا کرتے تھے اور ہفتوں رہتے تھے، لیکن اس عقیدت کے باوجود متعدد ایسے امور اور مسائل تھے، جن میں حکیم الامت کا مسلک کچھ اور تھا، اور ہمارے مولانا کا کچھ اور، اور اس کے اظہار میں انہوں نے کبھی مداہنت نہیں کی، محمد علی سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی،

جب نام ترا لیجیے، تب چشم بھر آوے

جس دن سے ان کا انتقال ہوا ہے، ملی سیاست سے عملی طور پر ایک قلم دستکش ہو چکے ہیں، ان